جنگل کی پہلی کہانی

زلفی

(آدمی کا بچہ جسنے بھیڑیوں میں پرورش پائی)

از

محمد عنایت اللہ بی اے

(بار دوم)

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ میں ۱۹۱۵ء طبع ہو کر

بک ڈپو علیگڈھ کالج سے شائع ہوئی

بچوں کے واسطے مفید اور دلچسپ قصّے

(جو بک ڈپو کالج علیگڈھ سے ملسکتے ہیں)

نفائس القصص و الحکایات - جس میں نہایت سلیس اُردو میں قران مجید کے قصّے مع عمدہ عمدہ حکایات کے جمع کئے گئے ہیں۔ قیمت ۶ر

چند پند - مصنفہ مولٰنا مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ دہلوی مرحوم مسلمان بچّوں کے لئے مفید اخلاقی مذہبی مضامین کا مجموعہ اسم بامسمّٰی ہے۔ بچّوں کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ قیمت ۴ر

منتخب الحکایات - مصنفہٗ مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی مرحوم بامحاورہ اُردو زبان میں (۷۷) ستتّر چیدہ حکایتیں مع اخلاقی نتیجوں کے بچّوں کی تعلیم کے لئے نہایت مفید ہے۔ قیمت ۴ر

امتیاز دلچسپی - یعنی ننھے بچّوں کے واسطے ۵۰ با تصویر کہانیاں قیمت ۴ر

حکایات عجیب - اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں درج ہیں۔ اور اُردو بامحاورہ اور عام فہم مضمون نہایت دلچسپ جس کے پڑھنے سے خود بخود ہنسی آتی ہے۔ بچّوں کے پڑھنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴ر

مصباح الادب - اس کتاب میں بھی نہایت مفید و نتیجہ خیز حکایات درج ہیں جو بچّوں و طالب علموں کے واسطے بہت دلچسپ ہیں قیمت ۴ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

نوجوان احباب کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ میں بعض تو وہ ہیں جن کو خود کچھ لکھنے کا شوق ہے۔ یہ احباب تو کسی دوسرے کے لکھے کو پڑھنا عذاب بلکہ عذاب سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔

بعض دوست ایسے ہیں جنہوں نے ایک خاص مذاقِ سخن پیدا کرلیا ہے۔ اور اُسکے ایسے ہی پابند ہیں جیسے کوئی اپنے مذہب کا پابند ہو۔ نئی تصانیف سے بالعموم اور انگریزی ترجموں سے بالخصوص انکو نفرت ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عداوت ہے۔ اُنکی طبیعتیں نہایت نازک ہیں جیسے سونے چاندی کے ورق ہوتے ہیں کہ جہاں ذرا سی ہوا لگی اور وہ ٹوٹے۔ اگر کوئی مبتدی کہ خود انھوں نے ابھی تک کچھ شروع نہ کیا ہو کچھ لکھکر انکو سنانے بیٹھتا ہے تو انکا جی بیٹھنے لگتا ہے۔ قلب کی حرکت بگڑ جاتی ہے۔ دل میں کہتے ہیں کہ یہ کمبخت کرکری روٹی کے نوالے بنا بنا کر ہمیں کھلانے کو کہاں سے آن مرا۔ اگر خدانخواستہ کہیں کسی محاورہ میں غلطی کی یا

کوئی متروک لفظ نادانستہ استعمال کر گیا۔ یا کہیں ‘‘کے’’ ‘‘کا’’ ‘‘کی’’ کی ترکیب میں اُلجھن پڑ گئی تو بس لکھنے والا قابلِ دار ٹھیرا۔ نہایت تلاش و جستجو سے کوئی ذکر ایسا چھیڑ دیا کہ پڑھنے والا خاموش ہو گیا۔ یہ دوست اپنے اخلاق کو اتنی وسعت نہیں دیتے کہ دوسرے کی حماقتوں کو سُننے میں اپنا وقت عزیز ضائع کریں گو اس وقتِ عزیز کا کوئی اور مصرف بھی اُس وقت نہ نکلتا ہو۔ اُنکے نزدیک کسی کی بات کو سُننا اُتنا بخل ہے جبکو سخاوت پر ترجیح دینا آسان ہے۔ یہاں تک تو کسی مضمون کو مصنف کی زبانی سُننے کا حال ہوا۔ رہا کتاب کا پڑھنا تو وہ بہت آسان ہے۔ کیونکہ کتاب کی قیمت پڑھنے کی مصیبت سے سبکدوش کر دیتی ہے۔

بعض احباب انگریزی داں ہیں۔ اِنکے دربار میں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں اِن صاحبوں کے نزدیک اُردو کتاب پڑھنے میں اگر ذِلت نہیں ہے تو خفت میں تو ہرگز کلام نہیں۔ اسکے علاوہ ان عزیزوں کو وقت کی قِلت روپیہ کی کمی سے بھی زیادہ خوار رکھتی ہے۔ گھڑیاں سب کے پاس ہوتی ہیں۔ مگر وقت کسی کے پاس نہیں نکلتا۔ بالخصوص حالتِ بیکاری میں۔ ایسے دوستوں سے متوقع ہونا کہ وہ کسی اُردو کتاب کو پڑھینگے اوّل درجہ کی گُستاخی ہے۔ انگریزی زبان کا علم جسقدر ہے وہ کافی ہے کہ اُردو زبان کوئی چیز نہیں۔ اس بحث کو زیادہ طول نہیں دیسکتا کیونکہ میرے پاس بھی وقت بہت کم ہے۔

بعض دوست مگر معدودے چند وہ ہیں جن کو ہر قسم کے لٹریچر میں ایک

لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ سُخن شناسی کو طبیعت کا جوہر سمجھتے ہیں۔ اور اگر کمی ہوتی
ہے تو اُسکو سیکھ کر ہر قسم کی تحریر کو پڑھنے کا مادہ پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ وصف
ہوتا ہے کہ جہاں کسی کے مُنہ سے کوئی اچھی بات سُنی یا کسی کتاب میں اچھا فقرہ دیکھا
پھر اس خیال میں کہ ہم اس سے بہتر کہہ سکتے ہیں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ
اُنکی طبیعت غیر حاضر رہتی ہے۔ اور سُننا یا پڑھنا بالائے طاق ہو جاتا ہے۔

غرض مجکو ان تمام دوستوں میں کسی سے بھی توقع نہیں کہ وہ اس قصّے کو
پڑھینگے اور نہ اُنکے نہ پڑھنے سے کوئی نتیجہ مترتب ہوتا ہے۔ اگر کسی کا ہنسنے کو
جی نہ چاہے تو کیوں ہنسے۔

لیکن اگر مفت نذر ہونیکے بعد اتفاق سے اس قصّے کو پڑھنے کی نوبت
آئے تو میرے اعتبار پر اتنا ضرور یقین فرمالیں کہ یہ ترجمہ نہیں ہے۔ اگر ترجمہ اور
تصنیف کے بیچ میں یا اُسکی حد سے باہر کوئی چیز تصنیف سے بھی زیادہ خونِ جگر
کی پینے والی ہو تو وہ یہ تحریر ہے۔ رُڈیرڈ کپلنگ صاحب کی مشہور کتاب
جنگل بُک کی یہ پہلی کہانی ہے۔ قصہ کے اکثر حصّوں کو بار بار پڑھکر مطلب کو
ذہن میں لایا ہوں اور اصل کتاب بند کر کے طرزِ تقریر اور اندازِ بیان میں
اُردو زبان کی رعایتیں کر کے مطالب کو لکھا ہے۔ اگر اُسکو بھی آپ اور ترجموں
میں شامل کریں تو خیر۔ وائے برحالِ من۔

اس قصّے سے نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے نہ کسی قسم کی صحیح معلومات

پیدا ہوتی ہے۔ محض لڑکوں کے ہنسانے اور اُنکا ذہن تیز کرنے اور تصور کو بڑھانے کے لئے جانوروں کی کہانی نئے پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔

ع - ا

۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آدمی کا بچہ اور اُس کے بھائی بھیڑیئے

(سیونی کا جنگل)

سیونی کی پہاڑیاں چاروں طرف سُنسان کھڑی تھیں۔ دن بھر بڑے زور کی گرمی پڑی تھی۔ سورج ڈوب کر اندھیرا ہونے کو تھا کہ ایک بھیڑیا دن بھر کی نیند لے کر چونکا۔ سر اُٹھاتے ہی دو چار جگہ سے پوستین کو چاٹا۔ دانتوں سے دُم کھجائی، پھر اُٹھکر ایک لمبی چوڑی انگڑائی لی اور ایک ایک پاؤں بڑھا کر پنجے چٹخائے تاکہ ناخنوں سے نیند کا خمار دور ہو۔ پاس ہی ایک چوڑے سے پتھر پر گھر والی کچھ سوتی کچھ جاگتی چار موٹے تازے ننھے ننھے بچوں کو کلیجے سے لگائے ایک طرف تھُتنی دوسری طرف دُم کمان کی صورت پڑی تھی۔ بچے خوب کِلل بِلل کر رہے تھے۔ توں توں کر کے ایک ایک گدا گد گرتا تھا اور دو چار لڑکنیاں کھا کر پھر ماں کے سینے سے جا چمٹتا تھا۔ جنگل میں اندھیرا بڑھتا جاتا تھا کہ اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہوگئی اور

بھٹ میں بھی جہاں یہ سارا کنبہ رہتا تھا اُجالا ہو گیا۔ بھیڑیا ہوشیار تو ہو ہی چکا
تھا، چاندنی دیکھتے ہی غرّایا اور زور سے چھینک کر بولا "اُٹھ یار بن باسی
شکار کا وقت آپہونچا۔ روزی کی فکر کر" یہ کہکر چاہتا تھا کہ بھٹ سے نکل کر
پہاڑ کے نیچے اُترے کہ گھر کی دہلیز پر جھاڑو کی سی پرچھائیں دکھائی دی
اور سفید سفید دانت اندھیرے میں پورے نظر نہ آئے تھے کہ آواز آئی
"عمر و دولت زیادہ فرزند جیئیں۔ دانتوں میں تیزی۔ پنجوں میں قوت
رات دن شکار ماریں کہ ہم بھوکوں کا بھی ساجھا رہے"
یہ جھوٹ سچ کے بھکاری میاں گیدڑ تھے۔ چونکہ فضلہ نوشی آپ کا
شیوہ تھا اس لئے سارے جنگل میں طباقی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے
ویسے بھی رکابی مذہب رکھتے تھے۔ اِدھر کی بات اُدھر لگا کر فساد ڈلوا دینا
اِن کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ رات دن چغلیاں کھانے کے علاوہ
گاؤں گاؤں چکر لگاتے تھے اور کوڑیوں پر جو کچھ ملتا تھا بے تکلف نوش
کرجاتے تھے۔ بھوک کے ایسے سچّے تھے کہ گوشت پوست تو درکنار پھٹے پرانے
چیتھڑے تک نوچ نوچ کر پیٹ میں بھر لیتے تھے۔ سوکھے چمڑے اور پُرانی
جوتیوں کا تو کیا ذکر ہے۔ غرض اسی کھانے پینے کی بے احتیاطی نے
اِن کو بھیڑیوں کی قوم میں جو ذات کے اونچے اور گھرانے کے سب میں

بڑے ہیں سخت ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ اور پھر اس خوش اوقاتی پر ایک طرہ یہ اور تھا کہ کبھی کبھی پاگل ہو جاتے تھے۔ اور خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میاں طباقی کا دل اُلٹے۔ سارا جنگل نمونہ محشر ہو جاتا ہے۔ پھر ان کو کس کا لحاظ۔ کس کی شرم۔ دُم سیدھی کئے جنگل میں دوڑتے پھرتے ہیں اور جو ملتا ہے اُس کو کاٹ کھاتے ہیں اور جو اپنا درجہ ہوتا ہے وہی دوسرے کا درجہ کرتے ہیں۔ اس لئے جنگل والوں کو ان سے نفرت ہی نہیں ہے بلکہ جان کا خوف بھی رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت پاگل ہو جاویں بھیڑیئے تو بھیڑیئے شیر تک کا یہ حال ہے کہ جہاں اِن حضرت کی دیوانگی کا حال سُنا اور ڈر کے مارے کہیں دبک کر بیٹھ رہا۔ سچ یہ ہے کہ بن باسیوں میں دیوانگی سے بڑھکر کوئی عیب نہیں اور یہ عیب اگر ہے تو میاں طباقی میں سب سے سوا ہے۔ ان ہی سے شروع ہوتا ہے اور ختم خدا جانے کس کس پر ہوتا ہے

بھیڑیا گیدڑ کی دعائیں سُنکر ٹھٹک گیا اور بے لطف ہو کر بولا۔

"میاں طباقی تم آتے بھی ہو تو ایسا وقت نکال کر آتے ہو کہ کھانے کے نام کا بھور اتک نہ نکلے بھلا اس وقت کیا رکھا ہے تمھیں یقین کیونکر آئے۔ اندر آکر خود دیکھ لو۔"

یہ سُنکر طباقی پھر دعائیں دینے لگے اور بولے "حضور جو کچھ فرمائیں

بجا ہے۔ اس وقت سرکار کے لائق خاصہ میں کچھ نہ ہوگا۔ مگر ہم بھوکے فاقہ کشتوں کو تو چچوڑی ہڈیاں بھی تازے شکار سے بڑھکر ہیں۔ کمین ذات کو اس سے کیا کہ سامنے کیا آیا۔ جو مل گیا پیٹ بھرنے سے کام۔" یہ کہکر میاں گیدڑ بھٹ میں داخل ہوئے۔ دور کونہ میں رات کی بچی کھچی ہرن کی ران پڑی تھی۔ گوشت برائے نام تھا۔ نری ہڈی ہی ہڈی باقی تھی۔ پیٹ میں آگ تو لگ ہی رہی تھی۔ بہت خوش ہوئے۔ دبے پاؤں آگے بڑھے اور دوزانو بیٹھ اگلے پنجوں اور دانتوں میں ہڈی پکڑ مزے لےلیکر چچوڑنے لگے۔

جب ہڈی کو چاٹ چوٹ بھکنی بنا دیا تو دو چار چٹخارے بھر کر بھیڑیے کی بیوی سے کہنے لگے "مائی صاحبہ! اللہ آپ کا بھلا کرے۔ اس وقت بڑا سہارا ہو گیا۔ خدا جانے کتنے در مانگنا پڑتا۔ اوہو! یہ تو میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ ماشاء اللہ ایک چھوڑ چار چار ہیں۔ اور پھر کیسے موٹے تازے نرم نرم ہیں (بچوں کو دیکھتے ہی میاں طباق کے منہ میں پانی بھر آیا)۔ اللہ عمر دے ابھی تو دودھ پیتی جانیں ہیں۔ جب کچلیاں نکل آئینگی ہاتھ پاؤں میں جان آجائیگی تو ان کی بہار دیکھیے گا۔ گبرو جوان ہو کر جاڑے گرمی پچھلے پہرے جب روند میں نکلا کرینگے تو شیر تک کے ٹکڑے اُڑا دینگے چہرے تو ملاحظہ

ہوں کیسے اصیل ہیں۔ آنکھوں کی چمک۔ حف میری نظر؟

گیدڑ یہ تو جانتا ہی تھا کہ بچّوں کے منہ پر بچّوں کی تعریف اچھّی نہیں ہوتی
دوسرے ماں باپ کو نظر گذر کا بھی ڈر رہتا ہے مگر خصلت کو کیا کرتا۔ جب
دیکھا کہ میاں بیوی کو یہ تعریف ناگوار گذری تو دل ہی دل میں خوش ہوا۔
کچھ دیر دم سمیٹے، پنجوں پر سر جھکائے خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کوئی تازی خبر
سنا کر نیا شگوفہ کھلائے کہ اتنے میں کچھ یاد آیا اور بھیڑیئے سے مخاطب ہو کر بولا
"آپنے تو شاید نہ سنا ہوگا۔ شیر خاں صاحب نے فی الحال اپنا شکار گاہ
تبدیل کر دیا ہے۔ کل شب کو خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ اس
چاند چاند صرف سیونی کی پہاڑیوں میں شکار کھیلا جائے گا۔"
شیر خاں نام کو تو خیر شیر تھے مگر اصل میں ایک لنگڑے بدطینت بد خصلت
جانور تھے جو یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر بان گنگا کے کنارے
ایک سوکھے نالے میں رہا کرتے تھے۔ پیدائشی لنگ رکھنے کی وجہ سے
اکثر تین ٹانگوں پر چلتے تھے۔ اس لئے جنگل میں بالعموم وہ حقارت
اور نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

یہ خبر سنتے ہی بھیڑیا ناخوش ہو کر بولا "یہ تو فرمایئے کہ آپ کے آقائے
نامدار کو جن کے آپ خانہ زاد ہیں کہیں آپ کی طرح کوئی سودا تو نہیں اٹھا ہے

بھلا یہ تو فرمائیں کہ جنگل کا وہ کونسا قانون اور ضابطہ ہے کہ بغیر اطلاع کیے
کوئی درندہ اپنے شکار کی جگہ تبدیل کر سکے۔ یہاں تشریف لائے تو سوائے
اس کے کیا ہوگا کہ کوسوں تک شکار ہوشیار ہو جائیگا اور مصیبت ہم پر آئیگی
جن کو فقط اپنا ہی پیٹ پالنا نہیں ہے بلکہ بیوی بچوں کا بھی ساتھ رکھتے ہیں۔
بھیڑیئے کی بات پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ گھروالی پڑے ہی پڑے
جل کر خاک ہوگئیں اور بگڑ کر بولیں۔ اے ہے سچ ہے۔ اس موئے
شیر خاں کی ماں اس کو لنگڑا لنگڑا یونہیں نہیں کہا کرتی تھی۔ یہ موا تو جنم کا
عیبی ہے۔ شکار کو وہ کیا جانے کس چڑیا کا نام ہے۔ ادھ موئی گائے
بھینسوں کے سوا ہم نے تو نہیں سنا کہ اس بے ایمان کو کچھ بھی ہاتھ لگا ہو
اور اب موا بے غیرت اس جوگا بھی نہیں رہا ہوگا۔ گاؤں کے اہیر پیچھے
پڑے ہونگے جو یہاں جان بچانے آیا ہے۔ خود تو فاقے مرچکا اور اب ہم کو
بھوکا مارے گا۔ اور جو یہاں بھی دشمنوں نے کھوج لگا کر ہانکا ڈال دیا اور
اس کھرسا کی سوکھی گھاس میں آگ لگا دی تو یہ موذی تو کہیں دفعہ دفان
ہو جائے گا۔ ہم ان بچوں کو لیکر کہاں غارت ہونگے۔ اے ہے۔ اس
جوانا مرگ شیر خاں نے اس کا ستیاناس جائے ہمارے ساتھ تو جب کیا
ایسا ہی سلوک کیا۔ اور اس نمک حرام گیدڑ کو تو دیکھو۔ اسے موت لیجائے

ہیں۔ یا خبریں سنانے آیا ہے۔ شیر خاں کے سامنے کچھ منہ سے نہ پھوٹا۔ آخر ہمارا نمک بھی تو کھایا تھا۔"

میاں طباقی یہ تیز باتیں سنتے ہی دُم دبا کر بھاگنے کو تیار ہو گئے مگر سوچے کہ کوئی نشانہ خالی نہ جاوے۔ فرمانے لگے "پھر اگر ارشاد ہو تو اس سلوک کا حال شیر خاں صاحب کی خدمت میں گزارش کروں۔"

بھیڑیا گیدڑ کی فطرت کو تاڑ گیا اور ایک دفعہ ہی بھبک کر بولا۔ "دور ہو موذی۔ جس کا غلام ہے اُسی کی خوشامد کر۔ آج کے شکار کا تو ناس کھو دیا اور کیا چاہتا ہے۔"

اتنا سنتے ہی میاں طباقی ایک چھلانگ میں بھٹ سے باہر آ گئے اور یہ کہتے ہوئے نوک دم بھاگے "بہت خوب۔ بہت خوب۔ بندہ رخصت خود ہی سن لیجئے۔ وہ ندی کے کنارے جھاڑیوں میں شیر خاں آن پہنچے۔"

بھیڑیئے نے جھٹ دونوں کان اونچے کر لئے اور غور سے سننا شروع کیا۔ پہاڑ کے نیچے جہاں گھاٹی میں ندی بہتی تھی غرانے کی آواز آئی۔ آواز میں ایسی گرج تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حالت بہت غیظ و غضب کی ہے اور اس بات کی مطلق پروا نہیں ہے کہ کوئی سنتا ہے یا نہیں بھیڑیا۔ اتنا سنتے ہی گھر والی سے کہنے لگا "سنتی ہو۔ اس احمق

کو۔ شروع رات کا تو شکار ہے اور آواز میں کس بلا کی تیزی ہے۔ بیوقوف سمجھتا ہے کہ ہمارے جنگل کے ہرن اور پاڑے بھی بان گنگا کی مریل گائے بھینسیں ہیں۔ آنکھوں کی اندھی کانوں کی بہری جن کو سوائے چرنے کے کسی بات کا ہوش نہیں''

بھیڑیئے کی بیوی بولی "واہ آپ بھی خوب سمجھے۔ کس کا ہرن اور کس کا پاڑا۔ یہ آدمی کا شکار ہو رہا ہے۔ ذرا غور سے سنو'' بھیڑیئے کی جورو یہ کہتی ہی تھی کہ آواز کی کیفیت بدل گئی اور اس کی گونج ایسی تیز ہوئی کہ سارے جنگل میں سما گئی۔ یہ وہ قیامت کی آواز ہے جو بیسیوں کو موت کا لقمہ بنا دیتی ہے۔ بھولے بھٹکے مسافر۔ غریب لکڑہارے اور بنجارے جن کی منزل شام سے پہلے ختم نہیں ہوتی تھک کر جنگل ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ یہ آواز ان کو گہری نیند سے جگا کر بدحواس کر دیتی ہے اور وہ اکثر جان بچانے کے لئے اسی طرف بھاگتے ہیں جدھر اس موت کا سامنا ہوتا ہے۔

بھیڑیا بیوی کی بات سنکر بہت تاسف اور غصہ سے بولا "استغفراللہ کیا گنگا کے کنارے کیڑے مکوڑے مرے مینڈک سڑی مچھلیاں پیٹ کو نہیں ملتیں کہ اب اس بدبخت نے آدمیوں کو مار مار کر کھانا شروع

کہا ہے۔ اور وہ بھی ہمارے جنگل میں"

بھیڑیئے کا یہ خیال کچھ بے جا نہ تھا کیونکہ انسان کی طرح جنگل کے رہنے والوں میں بھی ایک قانون جاری تھا یہ قانون بن پوتھی کے نام سے مشہور تھا اور تمام درندے چرند و پرند اس کے پابند تھے اس کا دریافت کرنا تو ذرا مشکل ہے کہ یہ قانون کی کتاب کن وقتوں سے جاری تھی مگر یہ سب جانتے تھے کہ اس میں کوئی بات بغیر دلیل اور ثبوت کے بیان نہیں کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ بن کی پوتھی میں بار بار حکم دیا گیا تھا کہ کوئی درندہ انسان کو قتل نہ کرے۔ صرف ایک صورت مستثنیٰ بیان ہوئی تھی اور وہ یہ تھی کہ جب کوئی ماں یا باپ اپنے بچوں کو شکار کے کرتب سکھاتا ہو اور محض تعلیم کی غرض سے مثالاً انسان کو شکار کر ڈالے تو مضائقہ نہیں مگر اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ اس قسم کا شکار ہرگز ان حدود کے اندر واقع نہ ہو جو اپنے غول کے شکار کے لئے مخصوص کی گئی تھیں۔ گو یہ قانون بہت سخت تھا اور اکثر درندوں کو اس کا متحمل ہونا شاق گزرتا تھا مگر پھر بھی سختی سے اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ اس کے کئی سبب تھے جن کو جنگل کے مہاپنڈت بھالو جی جھمورے نے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ پہلا سبب یہ تھا کہ جہاں کسی انسان کا قتل مشہور ہوا فوراً بہت سے دو ٹانگ کے کالے پیلے جانور ہاتھیوں پر چڑھ بندوقیں لے جنگل میں گھس پڑتے تھے

ں وچھان ہین مارتے تھے جس سے بن کے تمام جانوردن کو سخت
دیت پھونچتی تھی۔ دوسرا سبب بھالوجی نے یہ تحریر کیا ہے کہ خدا کی مخلوق
میں سب سے زیادہ کمزور اور محتاج انسان ہے اس لئے شان صیادی کے
خلاف ہے کہ ایسے بودے حیوان کا شکار کیا جاوے۔ تیسرا سبب جو سب سے
قوی تھا یہ تھا کہ جہاں کسی درندے نے آدم خواری شروع کی اور سوداوی
خلط کو ترقی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچلیاں جلد ٹوٹ جاتی ہیں اور
پوستین کے بال کم ہوتے ہوتے بالکل خارشتی ہوجاتا ہے۔

غرّانے کی آواز تیز ہوتے ہوتے ایک دفعہ ہی اڑاڑاڑا دوں کرکے
شیر دہاڑا اور دہاڑ کے ساتھ ہی کسی چیز کے گرنے کا دھماکا ہوا بھیڑیئے
کی جورو گھبرا کر بولی "معلوم ہوتا ہے شکار چھوٹ گیا۔ دیکھو تو کیا چیز
تھی" بھیڑیا دو چار قدم آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ شیر غصہ اور تکلیف
سے بے تاب ہو کر چنختا ہے اور ایک پنجہ زمین پر دے دے مارتا
ہے۔ یہ ماجرا دیکھکر بھیڑیا گھروالی سے بولا " یہ تماشا بھی دیکھتی ہو۔ احمق کو
اور کچھ نہ بن پڑا تو لکڑہاروں کے الاؤ پر جاکودا اور اگلا پنجہ جلالیا۔
طباقی بھی ساتھ ہیں۔ کیوں نہو۔ وزیرے چنیں شہر یارے چناں"

بھیڑیا اتنا کہنے نہ پایا تھا کہ بیوی نے دبی آواز سے کہا " دیکھنا
ہوشیار ہوجاؤ کوئی چیز جھٹ کی طرف آتی ہے"

یہ کہتے ہی گھاس میں کچھ آہٹ ہوئی اور بھیڑیا جھٹ دبکی لگا ہو بیٹھا۔ اب جو کچھ ہوا وہ دیکھنے اور حیرت کرنے کے قابل تھا۔ بھیڑیئے نے کسی چیز کو پاس آتا دیکھکر اُس پر جست کی، مگر جست پوری نہ ہوئی تھی کہ بیچ ہی میں رُکنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سے سیدھا چار ہاتھ اُڑکر دفعتاً پلٹا اور جہاں سے اُچھلا تھا پھر وہیں دھم سے آن گرا۔ اور گرتے ہی جھنجلا کر بولا "جا۔ کمبخت تیرا بُرا ہو۔ تو اِس وقت کہاں" بات یہ ہوئی تھی کہ بھیڑیئے نے جس چیز پر شکار سمجھکر جست کی تھی وہ آدمی کا بچہ نکلا جس کو ابھی پورا پاؤں پاؤں چلنا بھی نہ آیا تھا۔ کالا کلوٹا ننگا دھڑنگا۔ انگوٹھے چوستا۔ گرتا پڑتا۔ جھونکے کھاتا چلا آتا تھا۔ جونہیں بھیڑیئے سے چار آنکھیں ہوئیں کلکاریاں مار کر ہنسنے لگا۔

گھروالی بچہ کو دیکھتے ہی کہنے لگی "اے ہے۔ کیا آدمی کا پلا ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کو ذرا یہاں اُٹھا لاؤ۔ میں نے آدمی کا بچہ کبھی غور سے نہیں دیکھا"

بھیڑیئے نے بچہ کو مُنہ میں پکڑ کر اس طرح اُٹھایا کہ اُس کی نازک جلد پر دانتوں کا نشان تک نہ ہوا۔ اور بھٹ کے اندر لاکر اپنے بچوں میں ڈالدیا جو اتنے میں ماں کو چمٹ کر دودھ پینے لگے تھے۔ گو آدمی کا بچہ تھا پر بھیڑیئے کی بیوی مامتا رکھتی تھی۔ ترس کھا کر کہنے لگی "اے ہے۔ نگوڑا ذرا سی جان۔ بالکل ننگا بوچا ہے جاڑے پالے میں کیونکر جیتا ہوگا۔ دیکھنا موا نڈر کیسا ہے"

اِدھر یہ باتیں ہوتی تھیں اُدھر بچہ نے جو فرصت پائی ایک پلے کی دم

پکڑ اس کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ پلا ٹیاؤں ٹیاؤں کرکے چکر کھانے لگا اور یہ جھٹ گر ما ئی پا اس کی میا کے کلیجے سے جمٹ چپر چپر دودھ پینے لگا بچوں کی ماں یہ کیفیت دیکھکر حیران رہ گئی اور مسکرا کر میاں سے کہنے لگی۔ "یہ حرکت بھی دیکھی تم نے خدا جانے کس وقت کا بھوکا ہے۔ دیکھنا۔ میں کہتی ہوں اب کے دودھ کی تو کچھ کمی نہیں۔ مفت میں پل جائے گا۔ اور کچھ نہیں برادری میں نام تو ہوگا کہ ایسی عجوبہ چیز کسی کے ہاں نہیں۔ کہاں بھیڑیا کہاں آدمی۔"

بھیڑیا بولا۔ نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ بھیڑیے کے بھٹ میں آدم زاد کے ملنے کا ذکر تو اکثر سنا ہے مگر اپنے غول میں تو اتنی عمر ہونے کو آئی یہ بات نہ کبھی دیکھی اور نہ کبھی سنی۔ تم کو اس پر بہت ترس آیا۔ میں تو ایک ہی پنجہ میں کام تمام کر دیتا۔ جلد تو دیکھو کیسی نازک ہے۔ مگر آدمی کا گوشت مجھکو کیا کسی بھیڑیے کو بھی نہیں پچتا۔ دوسرے یہ مجھ سے ڈرا نہیں۔ دیکھو تو ایک ایک کو دیکھکر کیسا ہنستا اور ہمکتا ہے۔"

بھٹ میں یا تو چاندنی کھلی تھی یا گھپ اندھیرا ہو گیا۔ اور دروازہ میں جہاں سے روشنی آتی تھی شیر خاں نے اپنا چوکھونٹا جھاڑ جھنکار منہ اور اگلے دونوں پنجے ڈالدیئے۔ مگر شانے غار کے منہ میں پھنس گئے۔ طباقی دم کے ساتھ لگے آواز لگاتے تھے "جی ہاں حضور جی ہاں حضور۔ شکار اسی بھٹ میں گیا ہے۔"

بھیڑیا یہ قصہ دیکھتے ہی ہوشیار ہوا اور استعجاباً دونوں کان کھڑے کر شیر سے کہنے لگا "آپ نے بڑا کرم کیا جو یہاں تک تکلیف فرمائی۔ مگر وہ ایسی کونسی ضرورت تھی جو اس زحمت کا باعث ہوئی؟"

شیر خاں بہت ہی کچھ منہ پھلا کر غرّاسے "باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ سیدھی طرح بتاؤ ہمارا شکار کہاں ہے ایک آدمی کا بچہ اس رستہ آیا ہے۔ اُس کے ماباپ بھاگ گئے ہیں اور وہ بھٹک گیا ہے۔ مگر وہ ہمارا شکار ہے فوراً حاضر کرو!"

یہ تو آپ بھیڑیئے کی زبانی سُن ہی چکے ہیں کہ شیر خاں لنگڑے۔ بھوک میں بے تاب گھبرا کر ایک لکڑ ہارے کے دہکتے الاؤ پر جا کودے تھے اور اگلا پنجہ جلا چکے تھے۔ اِس وقت کچھ تو ہاتھ میں جلن ہو رہی تھی اور کچھ شکار چھوٹ جانے پر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ غرض حالت غیر تھی۔ بھیڑیا سمجھ گیا کہ شیر کی نیت فساد کی ہے مگر اطمینان تھا کہ بھٹ کا منہ اتنا چوڑا نہیں ہے کہ شیر خاں گھر کے اندر باز پرس کے لیے تشریف لے آویں۔

بھیڑیئے نے شیر کی گفتگو سنکر صاف صاف کہنا شروع کیا کہ "خاں صاحب یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہم بھیڑیوں کی قوم ایک بالکل با اختیار اور آزاد قوم ہے۔ جو کچھ حکم احکام ہم پر جاری ہو سکتے ہیں وہ صرف ہماری قوم کے سردار کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ کسی داغی جانور چتکبری کھال والے مُردار خوار کی

مجال نہیں ہے کہ ہم کو ہمارے گھر میں آ کر حکم سنائے۔ آدمی کا بچہ ہمارا ہے چاہے ہم اُس کو ماریں چاہے جلائیں۔ آپ کو اُن سے کیا مطلب وغرض؟"

شیر خاں کو اتنی بات کی تاب کہاں تھی۔ غصہ سے آنکھیں لال کر کے بولے "او کتے بکتا کیا ہے۔ منہ سنبھال۔ بڑا چاہنے نہ چاہنے والا آیا۔ جانتا بھی ہے ہم کون ہیں۔ ہم سارے جنگل بیابان کے بادشاہ ہیں جن کی حکومت کا ٹالنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تو سمجھتا کیا ہے۔ سوگند ہے اُس موٹے بچار کی جس کو ہم نے ابھی ابھی گنگا کے نالے میں پچھاڑا ہے کہ ایک پل میں تیرے سارے کنبہ کو غارت کر دیا جائے گا۔"

اتنا کہتے ہی شیر خاں غار کے منہ پر اس زور سے دہاڑے کہ بھٹ میں خاک اُڑنے لگی اور سارا پہاڑ لرز گیا۔ بھیڑیئے کی جورو یا تو چپ پڑی یہ قصہ سنتی تھی یا ایک دفعہ ہی جھرجھری لے بچوں کو دور جھٹک دُم گردن پھلا ایک کر شیر کی طرف آئی۔ اِدھر غصہ سے شیر کے دیدے سُرخ انگارا ہو گئے تھے اُدھر بھیڑیئے کی جورو کی آنکھیں بھی سبز لال ٹمیوں سے کم نہ تھیں۔ غرض جب یہ سُرخ اور سبز روشنیاں قائم ہو گئیں اور غراٹوں کے ساز خوب اونچے کھچ لئے تو بھیڑیئے کی بیوی نے یہ زہر اُگلا۔

"او موذی۔ تو شیر ہے تو اِدھر دیکھ میں بھی جنگل کی ڈائین ہوں۔ کلیجہ تک چبا جاؤنگی۔ بڑا دانت نکوسے غُرفش کرتا۔ گیدڑ کو حمایتی بنا کر آیا ہے۔

"ہمار اشکار حاضر کرو۔ ہمار اشکار ادھر آیا ہے" ارے مُردے تو کیڑے مکوڑوں کا کھانے والا۔ گائے بھینس چوٹا تجھے شکار کبھی نصیب بھی ہوا ہے۔ جنم کے لنگڑے تیرے ویدوں میں خاک۔ یہ آدمی کا بچہ ہمارا ہی او رلاکھ میں ہمارا ہی تو مانگنے والا کون ہوتا ہی مجال ہے اس کا کوئی بال بیکا تو کرلے بوٹیاں اُڑادوں۔ خون پی جاؤں۔ ہڈیاں تک نہ چھوڑوں۔ مجھ ڈائن کو تو جانتا نہیں۔ ذرا کان کھولکر سُن لے۔ تھرن کی چھاتی پی کر یہ بچہ جنگل کا شکاری بنے گا۔ ایک دن جنگل چھان مارے گا اور تجھکو مار کر تیری کھال نہ کھینچی ہو تو میرا نام تھرن نہیں۔ خیر ہے تو سیدھا چلا جا نہیں تو میاں غریب بیٹھ کر رو دیگی کہ برخوردار تین ٹانگ سے دو ہی ٹانگ کے رہ گئے۔ دُور ہو۔ موے۔ مُردے خور جنگل کے جلے جانور۔ لنگڑے بیری"

یہ تقریر سُنکر تو بھیڑیے کے بھی اوسان خطا ہوئے۔ اور وہ وقت آنکھوں میں پھر گیا جبکہ شباب کا عالم تھا اور بندھیاچل کے پہاڑوں میں اِن بلائے بے درماں سے پہلی مُٹھ بھیڑ ہوئی تھی۔ جب بھی تھرن ہی کے نام سے یہ مشہور تھیں۔ دس پانچ دکھنی بھیڑیے جن کی ہیبت سے سارا جنگل تھرّاتا تھا اِن کے ساتھ جلوس میں رہتے تھے۔ بڑی بڑی خونریزیوں کے بعد یہ نوبت آئی کہ زُمرہ احباب میں شامل ہو کر اِن سے بیاہ کی ٹھیر جاوے۔

شیر خاں کا حال یہ تھا کہ بھیڑیے کا یعنی شوہر کا مقابلہ تو وہ آسانی سے کرلیتے لیکن تھرن سے اِن کی روح بھی فنا ہوتی تھی۔ اوّل تو بہت ایسا

تنگ و تاریک تھا کہ وہاں لڑنا سخت دُشوار تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ زچہ خانے میں لڑ کر جی کھو دینا بی قہرن کے نزدیک کوئی بات نہ تھی بغرض شیرِ نر لڑنا مناسب نہ سمجھا اور غار کے مُنہ سے اُلٹے پاؤں غُرّاتا ہوا باہر آیا اور دو قدم ہٹ کر کہنے لگا۔

"بھونکے جا کُتیا۔ تیرے ساتھ کون بھونکے۔ دیکھ تو سہی۔ کیسا بتاتا ہوں بڑی چودھرائن بنکر بیٹھی ہے جنگل کے اونچ بھی تو ابھی جیتے ہیں۔ وہ بتا دینگے آدم زاد کا پالنا کیسا ہوتا ہے۔ یاد رکھو یہ بچہ ایک دن ہماری ڈاڑھ گرم کرے گا۔ ٹھیر جا۔ دُم دار چوہٹی۔ کل جبھی ڈائن اس بدزبانی کا مزہ ایک دن خوب چکھاؤنگا۔"

یہ کہکر شیر خاں اپنے رستہ چلے۔ طباقی بھی دل میں شرمندہ دُم دبائے کان نیچے کئے ہرکارے کی چال روانہ ہوئے۔ چاند کو دیکھ دیکھ کر روتے جاتے تھے اور سوچتے تھے کہ پاس کوئی جوہڑ ملے تو ڈوب مریں۔ مگر بے غیرتوں کو موت کہاں۔ تھوڑی دُور دَوڑنے کے بعد سب کچھ بھول گئے اور آدھی پر ابھی ایک نہ بجا تھا کہ اور بھائی بندوں کے ساتھ بَن کی چوکیداری کرنے لگے۔

اب سُنئے کہ جب شیر بھٹ سے چلا گیا تو بی قہرن اپنے بچوں میں آن پڑیں۔ جنھوں نے رو رو کر سارے بھٹ کو سر پر اُٹھا لیا تھا۔ آخر غورت

ذات تھیں دم قابو میں نہ رہا ناتوانی سے ہانپنے لگیں اور دیر تک چپ بیٹھی غصہ کو دبا کیا کیں۔

دیر تک میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے آخر کو بھیڑیا بولا "ایک بات شیر خاں نے ذرا ٹیڑھی کہی ہے۔ ذرا خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر اس بچہ کو اپنے ہاں رکھتی ہو تو ایک دن پنچوں کے سامنے اسے لے جانا ہوگا۔ کیا بالکل جی میں ٹھان لی ہے کہ اس کو پالوگی۔ ہم تو جانیں کھا پی کر فیصلہ بھی کرو۔ کیوں بات بڑھائے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی"

تھرن بگڑ کر بولیں "مجھے یہ بے وقت کی ہنسی بھلی نہیں لگتی۔ آخر تمہارے منہ پر بھی تو دیدے ہیں۔ اتنا نہیں سوجھتا کہ یہ نگوڑا ذراسی جان اول تو گرتا پڑتا اپنے آپ ہمارے بھٹ تک آیا۔ رات گئے آیا۔ بھوکا آیا۔ ننگا آیا۔ کسی سے نہ ڈرا آتے ہی چھاتی پینے لگا۔ پھر پوچھتے ہو پالوگی۔ یہ بات بھی پوچھنے کی ہے۔ آدمی خود تو سوچے۔ پھر یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ تمہارا کیا جائیگا۔ اس موئے لنگڑے قصائی کی طرح تم بھی کھا پی کر گنگا کے کنارے جا سونا اور اس بھٹ کو آگ لگوا دینا" اتنا کہہ منہ موڑ بچہ کی طرف ہو بیٹھی۔ اور بچہ سے پیار کی باتیں کرتے کرتے دُم سے تھپک تھپک کر اُس کو سُلا دیا۔

بھیڑیا دل میں بہت نادم ہوا اور بولا "یہ تو سب سچ ہے۔ پر اس کا بھی کچھ فکر ہے کہ جب برادری والے سُنینگے تو کیا کہینگے" تھرن نے میاں کی بات کا کچھ جواب نہ دیا اور بچوں میں مصروف رہی۔ بھیڑیا اس وقت بہت پریشان

تھا۔ شکار کا وقت نکل چکا تھا۔ دوسرے طبیعت یکسو نہ رہی تھی۔ اس حالت میں شکار کو نکلتا بھی تو کیا خاک ملتا۔ پھر یہ قصہ آدمی کے بچّہ کا ایسا چھڑا تھا کہ انجام سمجھ میں نہ آتا تھا۔ غرض جب اپنی عقل نے کچھ مدد نہ کی تو ضابطہ جنگلات پر اس طرح غور کرنے لگا۔

جنگل کے قانون میں لکھا ہے کہ شادی کرتے ہی ہر ایک بھیڑیئے کو اختیار ہے کہ غول سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن اگر اس مفارقت کے زمانہ میں اس کے ہاں بچے ہو جاویں تو پھر اُس کا فرض ہوتا ہے کہ ان بچّوں کو جس وقت وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوں پنچ پربت پر حاضر کرے جہاں مہینے کے مہینے چاند کی چودھویں رات کو بھیڑیوں کی پنچایت ہوا کرتی تھی۔ اور برادری کے سب چھوٹے بڑے اس میں شریک ہوا کرتے تھے پنچایت میں بچّوں کا بُلانا اس لئے ضروری قرار پایا تھا کہ سب بڑے بوڑھے بھیڑیئے برادری کے بچّوں کی شناخت کرلیں اور اُن کو خوب پہچان لیں تاکہ آئندہ لاعلمی کی وجہ سے کوئی فعل کسی بھیڑیئے سے اُن قواعد کے خلاف عمل میں نہ آوے جن میں بچّوں کی تہذیب و تربیت و حفاظت کے لئے خاص احکام منضبط کئے گئے تھے۔ جس وقت اس قاعدہ کے بموجب تمام چھوٹے بڑے پلوں کا معائنہ ختم ہو جاتا تھا تو پھر یہ پلّے کچھ دنوں تک بالکل آزاد کر دیئے جاتے تھے کہ جہاں چاہیں اُچھلتے کودتے پھریں۔ جس بھٹ میں چاہیں بے پوچھے چلے جائیں۔ جس بھیڑیئے کا چاہیں کان پکڑ کر لٹک جائیں۔

یا دُم پکڑ کر گھسیٹ لیں۔ اور جب تک یہ پلے جوان ہو کر اپنا پہلا ہرن خود شکار نہ کریں کسی بھیڑیئے کو خواہ بھوکا ہو یا پیٹ بھرا یہ حکم نہ تھا کہ ان پلوں میں سے کسی پلے کو جان سے مار ڈالے۔ اور اگر کوئی بھیڑیا ایسا کرتا تھا تو فوراً گرفتار ہو کر قتل کیا جاتا تھا۔ بھالوجی نے اس سزا کی کوئی وجہ تو نہیں لکھی ہے لیکن اگر آپ ذرا بھی عقل سے کام لیکر سوچینگے تو فوراً سمجھ لیں گے کہ یہ قانون کس قدر انصاف پر مبنی تھا۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ بھیڑیئے کے لئے یہ زمانہ سخت تردد و پریشانی کا تھا۔ اول تو بیوی کی آئے دن کی بدمزاجی سے بجائے ناک کے تھتنی میں دم رہنے لگا تھا۔ ایک ایک جھول میں اتنے بچے دیتی تھیں کہ شکار مارتے مارتے ایک طرف کی پسلیاں دوسری طرف کی پسلیوں سے وصل ہو گئی تھیں۔ پھر مرے پر سو درے آدمی کا پلہ اور پال بیٹھیں۔ اُدھر شیر خاں اور طباقی کی طرف سے اندیشہ تھا کہ معلوم نہیں برادری میں کیا جا لگائیں۔ سرمجلس آبرو ریزی کے درپے ہو جائیں غرض اس فکر میں دن سو سو کر اور رات شکار کے پیچھے دوڑ دوڑ کر دو تین مہینے کاٹے اور جب بچے ذرا ہوشیار ہو گئے تو ایک دن شام کو چودھویں رات کا چاند نکلتے ہی مع اہل و عیال کے بھٹ سے نکلے۔ آگے آگے خود ہوئے بیچ میں بچوں کو لیا۔ بیوی پلوں کو گھرکتی گھرکاتی کہ کہیں کمبخت بھٹک نہ جائیں پیچھے پیچھے چلیں اور بہ ہزار دشواری پنچایت والے پہاڑ پر صحیح سلامت پہونچیں۔ یہاں پہاڑ

کی چٹیل چوٹی پر بہت سے اونچے اونچے چٹانوں کے ٹکڑے بے ترتیبے پڑے تھے۔ تھوڑی سی جگہ ہموار تھی باقی اونچے اونچے پتھر اور ٹیلے تھے جن کی اوٹ میں اگر خدانخواستہ برا وقت آئے تو سیکڑوں بھیڑیئے فوراً چھپ جائیں۔ ان پتھروں میں جو سب سے اونچا پتھر تھا وہاں قوم کا سردار ایک بڑا نا گرگ باران دیدہ جو جنگل کے صدہا طوفانوں کو جھیل کر دشت و کوہسار کے جملہ نشیب و فراز سے اپنے غول کی رہنمائی میں شہرۂ آفاق ہوچکا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے ہاتھ پاؤں پھیلائے اگلے پنجوں پر ٹھڈی رکھے لیٹا تھا۔ قوم کے شایستہ لوگوں میں اس کا نام یکتائی مشہور تھا مگر عرف عام میں اس کو چودھری کہا جاتا تھا۔ صحرائی زندگی میں آزمودہ کار ہونیکے علاوہ عالم شباب میں کہ عقل پختہ نہ ہوئی تھی کئی بار انسان کے دام میں گرفتار ہوچکا تھا۔ لیکن بخت کی یاوری اور عقل خداداد کی رسائی نے گردن جثیہ سلامت رکھی۔ ایک دفعہ گاؤں والوں کے اتنے لٹھ کھائے کہ بیابان مرگ کی سرحد تک پہونچ گیا اور جنت کی نیل گائیں نظر آنے لگیں۔ قاتلوں نے مُوا سمجھکر نعش کو بے گور و کفن چیل کوؤں کے سپرد کیا اور بڑے بڑے گدھ مرگھوڑ سے اٹھکر کریا کرم کے لئے حاضر ہوگئے۔ مگر سخت جان تھا۔ موت نہ آئی۔ جلد تو انا و تندرست ہوگیا۔ غرض ایک مدت کی سیاحی اور بادیہ پیمائی نے ساکنان صحرا کے حالات ہی سے آگاہ نہ کیا بلکہ انسان کے خصائل و عادات کا تجربہ بھی وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی نقصان کے ساتھ حاصل ہوتا رہا۔ کبھی گردن بچی تو ٹھڈی

پر زخم آیا اور کبھی ٹانگ سلامت نکل آئی تو دُم کٹ کر رہ گئی۔ غرض قوم کی رہبری کے لئے اس سے زیادہ لائق اور تجربہ کار بھیڑیئے کا ملنا دشوار تھا اور اب ایک برس ہونے کو آیا تھا کہ اس جلیل القدر منصب کی سخت ذمہ داریوں کو نہایت نیک نامی سے انجام دے چکا تھا۔

چٹان کے نیچے جس پر سردار بیٹھا تھا پہاڑ کی ہموار چوٹی پر غول کے جملہ خرد و بزرگ جمع تھے۔ خاکی رنگ کے جوان بھیڑیوں سے لیکر جن کو بزرگوں کی مجلس میں نچلا بیٹھنا دشوار تھا اور جو داب محفل کے خلاف اکثر دُم سے پیچھے جھاڑتے تھے یا پنجوں سے کان کھجانے لگتے تھے بڑے بڑے مسن آزمودہ کار بھیڑیے سیاہ رنگ گلیم پوشانِ خونی چشم جو یکہ وتنہا اپنے سے چوگنے ڈیل کے بارہ سنگھے کو چشم زدن میں خاک کا پیوند بنا دیں حاضر تھے۔ اور ایک حلقہ میں ادب سے دوزانو بیٹھے نہایت متانت کے ساتھ ہلکے تنفس میں ہانپ رہے تھے۔ حاضرین کی تعداد چالیس سے کم اور پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ حلقہ کے اندر وہ خاندان جمع تھے جو اپنی اولاد کو قوم کی شناخت اور معائنہ کے لئے لائے تھے۔ اور بیچوں بیچ بی قہرن بچوں کو سامنے لئے میاں کے پہلو میں کسی قدر بےچین بیٹھی تھیں۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ بچے البتہ کشتیاں لڑتے لڑتے چوٹ کھا کر رونے لگتے تھے تو ماباپ فوراً دو چار گھرکیاں دیکر اِن کو خاموش کر دیتے تھے۔ چودھویں رات کا چاند آسمان سے جنگل اور پہاڑوں پر نور برسا

رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بوڑھا بڑا بھیڑیا ضعف بصارت سے معذور حلقہ سے اُٹھتا اور کسی بچہ کے پاس آکر اُس کو خوب غور سے دیکھ بھالکر پھر اُلٹے پاؤں دبی چال اپنی جگہ جا بیٹھتا۔ کبھی کبھی کوئی ماں اس خیال سے کہ برادری والے کہیں میرے بچہ کو پہچاننا نہ بھول جاویں بچہ کا کان پکڑ کر کہیں چاندنی میں بٹھا آتی تھی۔ کبھی کبھی چودہری چٹان پر سے دُم ہلاکر آواز لگاتا تھا "بھیڑیو۔ بھیڑیو۔ دیکھ لو بھال لو۔ پہچان لو۔ اپنی نسلوں کو نہ بھولو" اتنا سُنتے ہی بچے والیاں بھی یہ ہی آواز لگاتی تھیں اور سارا جنگل گونج اُٹھتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں پھر وہی پہلا سناٹا ہو جاتا تھا۔

اب وہ وقت آیا کہ آدمی کا بچہ بھری پنچایت کے سامنے پیش ہو۔ تھرن کی گردن پھول کر کپّا ہو گئی اور چندیا کے بال کھڑے ہو کر سوئیوں کی طرح چمکنے لگے۔ بھیڑیے نے اُٹھ کر زلفی کی ٹانگ پکڑی اور اُس کو حلقہ کے بیچوں بیچ لاکر بٹھا دیا (ہم شاید یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ بھیڑیے کی بیوی نے اس بچہ کا نام زُلفی رکھا تھا اور پیار سے میگھا بھی کہا کرتی تھی۔ کیونکہ اِن کو آدمی کے بچہ کی صورت مینڈک سے بہت ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی) بچہ پہلے تو کچھ لسورا مگر پھر چاندنی میں چمکتی کنکریوں کو دیکھ خوش ہو کر اُن سے کھیلنے لگا۔

چودھری نے پنجوں پر سے سر تک نہ اُٹھایا اور اُسی کھرکھرائی آواز سے پکارتا رہا "بھیڑیو۔ بھیڑیو۔ دیکھ لو بھال لو۔ پہچان لو۔ دستور کو نہ بھولو"

اتنے میں چٹانوں کے پیچھے سے شیر خاں کی آواز آئی گھٹا کے بادل کی طرح گرجی۔ اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ بھیڑیوں نے سنا کہ "اے بھیڑیوں کے سردار یہ بچہ ہمارا شکار ہے اور ہم کو ملنا چاہیے۔ بھیڑیوں کی آزاد قوم کو آدم زاد سے کیا واسطہ" چودھری نے اس فریاد پر اتنی توجہ بھی نہ کی جتنی منہ کی مکھی اڑانے میں کان کو زحمت ہوتی ہے۔ اور اسی طرح پنجوں پر منہ رکھے پکارتا رہا۔ بھیڑیو۔ بھیڑیو۔ دیکھ لو۔ پہچان لو۔ ہم آزاد لوگوں کو سوائے اپنی قوم کے کسی کا حکم ماننے کی ضرورت نہیں۔ دیکھ لو۔ اور پہچان لو۔ برادری کے بچوں کو نہ بھولو"

شیر خاں کی آواز سنتے ہی سب برادر غرّانے لگے۔ اور ایک جوان بھیڑیا جو تین چار برس سے زیادہ کا نہ ہوگا اٹھا اور سردار سے مخاطب ہو کر بولا "بیشک ہم آزاد لوگوں کو انسان سے کیا غرض اور واسطہ ہے"

اب ذرا قصہ سمجھنے کے لئے جنگل کا ایک دستور اور سن لیجئے۔ بھالو جی اپنی پوتھی میں لکھتے ہیں کہ اگر کبھی کوئی بھیڑیا کسی بچہ کو جو بھیڑیئے کا بچہ نہ ہو اپنی برادری میں شامل کرنا چاہے تو جب تک برادری کے دو پنچ اور جو اس بچہ کے ماں باپ نہ ہوں بچہ کو شامل کرنے کی رائے نہ دیں اس وقت تک وہ بچہ غول میں ہرگز شامل نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ جملہ حاضرین کو اصول قانون میں غایت درجہ کی مہارت تھی اس لئے صدر انجمن کی طرف سے سوال ہوا۔ "اس آدمی کے بچہ کا جو حامی ہو وہ کھڑا ہو اور اپنی رائے ظاہر کرے"

جب کسی نے جواب نہ دیا تو سوال پھر پڑھا گیا۔ اس پر بھی جب کسی طرف سے
کوئی صدا بلند نہ ہوئی تو تھرن ہلکی سی جھرجھری لے جان کھونے کو مستعد ہوگئی
اور دل میں سوچ لیا کہ آج کا مقابلہ بچے پالنے کی مصیبت سے ہمیشہ کو آزاد کردیگا
پھر نہ اپنا جی ہوگا نہ یہ عذاب۔

اب سُنئے کہ بھیڑیوں کی پنچایت میں کسی غیر قوم کے جانور کو شریک
ہونے یا گفتگو کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مگر بھالو جی جمورے جو ایک بڑے کاہل
وجود بھوری رنگت کے ریچھ تھے اور بھیڑیوں کے بچوں کو بن کی پوتھی پڑھایا
کرتے تھے اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے۔ چونکہ صرف میووں اور شہد پر ان کا
گذران تھا اس لیے سب لوگ عزت کی نگاہ سے اُن کو دیکھتے تھے اور اُن کی
نقل و حرکت پر کوئی بھیڑیا معترض نہ ہو سکتا تھا۔ غرض جب دو دفعہ سوال
پڑھا گیا اور کسی نے جواب نہ دیا تو ایک چٹان کے پیچھے سے بھالو جی یہ کہتے
ہوئے نکلے "پنچو۔ پنچو۔ ہماری بھی سُن لو۔ ہم سیدھی اور سچی بات کے کہنے
والے ہیں۔ جو کہیں وہ مان لو۔ اس آدمی کے بچہ کو غول میں شریک کرنے میں
کچھ قباحت نہیں ہے۔ اُس کی تعلیم و تربیت کے ہم ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بس،
ہماری اتنی سفارش کافی ہے"

یہ سُنکر چودھری چٹان پر سے بولا "بھائیو۔ سُنتے ہو۔ بھالو ہمارے بچوں کا
گرو اور ہمارا بڑا ہے۔ سچی بات جو تھی وہ اُس نے کہدی۔ اب ایک بھائی

کوئی اور اُٹھے اور گرو کی ہاں میں ہاں ملائے تو اس بچہ کا جی بچ جاوے،،
اتنا کہنا تھا کہ ایک کالی کالی چمکتی پرچھائیں حلقہ کے بیچوں بیچ دکھائی دی
اور بھیڑیوں میں غل پڑا کہ بگیرا آن پھونچا۔ دُم کی نوک سے ناک کی پھننگ
تک بالکل سیاہ جیسے اندھیری رات سیاہ مخمل کی پوستین پر دھوپ چھاؤں کے
گُل بوٹے کالی اطلس کی سی جھمک دکھاتے تھے۔ اس وقت جتنے بھیڑیے موجود
تھے وہ بگیرے کو خوب جانتے تھے کیونکہ یہ وہ بزرگ تھے جن کو رستہ میں ٹوکنا
کسی بھیڑیئے کے لئے آسان کام نہ تھا۔ ذہانت و فطانت میں طباقی کے کان
کاٹتے تھے۔ ہمت و مردانگی میں جنگلی بجار کے چچا تھے اور جب بگڑ بیٹھتے تھے تو
مست ہاتھی کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ مگر زبان کے بہت میٹھے تھے آواز
ایسی نازک اور شیریں تھی جیسے درخت کے پتوں پر شہد کی بوندیں ٹپکتی ہوں
اور جلد ایسی نرم تھی جیسے ریشم کے لچھے۔

جلسہ میں قدم رکھتے ہی غرّائے کہ ،، اے قوم کے سردار اور سیونی کے آزاد
بھیڑیو۔ گو مجکو اس مجمع میں گفتگو کرنے کا حق نہیں لیکن چونکہ ایک بڑے اصول
قانون کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اس لئے محض یہ کہنا ہے کہ کسی مسئلہ قانون پر
جو متعلق خونریزی کسی بچہ شیر خوار کے ہو اگر کوئی قطعی رائے قائم نہ ہو سکے
تو ایک معقول معاوضہ قبول ہونے کے بعد اُس بچہ کی جان کو سلامتی دیجا سکتی
ہے اور قانون نے کہیں تخصیص نہیں کی ہے کہ اُس معاوضہ کا پیش کرنے والا

کون ہو۔ اب اہل جلسہ فرمائیں کہ جو کچھ عرض کیا وہ واجب ہے یا غیر واجب "
بہت سے بھوکے بھیڑیئے جن کے پیٹ میں ہمیشہ آگ لگی رہتی ہے بول
اُٹھے "بے شک آپ کا فرمانا بالکل بجا و درست ہے۔ بھائیو۔ سُن لو۔ پیٹ کی
آنچ بُری ہوتی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ملے تو اس بچّہ کی جان سلامت چھوڑ دو۔
جنگل کا یہی دستور ہے "

بگیرا۔ اچھا تو یہاں تک آپ نے میری بات کو تسلیم کیا۔ اب میں اجازت
چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے آگے کہنا ہے وہ بھی گزارش کردوں "

بھیڑیئے " ہاں۔ ہاں۔ ضرور، ضرور "

بگیرا " پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک دودھ پیتے بھوکے ننگے بچّہ کو ہلاک
کرنا سخت بُزدلی اور کوتاہ اندیشی کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ یہی بچّہ جوان ہوکر
ایک زیادہ لذیذ اور فربہ شکار آپ صاحبوں کے حق میں ثابت ہو۔ دوسرا امر یہ
ہے کہ ابھی ابھی بھالو جی نے اس بچّہ کی سفارش کی ہے۔ میں کسی لائق نہیں مگر
اس سفارش کی تائید میں ایک بہت فربہ اور خوبصورت بیل جس کو ابھی شکار
کرکے یہاں سے ہزار قدم پر یوہیں سالم چھوڑ آیا ہوں۔ برادری کی ضیافت کے
لئے پیش کرتا ہوں اُس کو قبول فرمائیے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس آدمی کے بچّہ کی
جان ہی سلامت نہ رکھی جاوے بلکہ اُس کو غول میں شریک ہونے کے بعد
تمام ایسے حقوق وقتاً فوقتاً حاصل ہوتے رہیں جو برادری کے ہر ایک آزاد بھیڑیئے

کو حاصل ہوا کرتے ہیں۔ آپ صاحبوں کو اس میں کیا عذر ہے؟"

بھوکے بھیڑیئے سب کے سب بول اُٹھے "ہرگز کسی قسم کا عذر نہیں۔ اس وقت کی ضیافت چھوڑنی حرام ہے۔ ہم کیوں اپنی گردن پر خون لیں جاڑے پالے میں آپ مر جائے گا۔ مہاوٹوں کے مینہ شروع ہوتے ہی کام تمام کر دینگے جاڑے میں بچ گیا تو جیٹھ بیساکھ کی گرمی میں جل بھُن کر خاک ہو جائے گا۔ ہاں ہاں ہم کو سب کچھ منظور ہے۔ وہ تازہ شکار فرمایئے کدھر ہے" یہ غُل سنتے ہی چودہری نے فقط ایک کان کھڑا کر لیا اور چٹان پر سے آواز لگائی "بھیڑیو۔ بھیڑیو۔ دیکھو سمجھ لو بات کو نہ بھولنا۔"

زلفی جس جگہ بیٹھا تھا وہیں بیٹھا کنکریوں سے کھیلتا رہا۔ اور کچھ خبر نہ ہوئی کہ کس طرح ایک ایک بھیڑیا اُس کے پاس آیا اور اُس کو خوب اچھی طرح پہچان کر چلا گیا۔ غرض جلسہ کے جب اور سب امور طے ہو لئے تو پنچایت برخاست ہوئی بھیڑیے شکار کا پتہ پوچھکر ضیافت کھانے چل دیئے اور پہاڑ کی چوٹی پر اب فقط چودہری بھالو بگیرا۔ زلفی اور اُس کے نئے اماں باوا رہ گئے۔ شیر خاں رات کے سناٹے میں پچھلے پہرے تک دھاڑتے رہے بہت خفا تھے کہ زلفی نے ڈاڑھ گرم نہ کی۔

جب کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ دُور کی پہاڑیوں سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی تھی تو بگیرا بے اختیار یہ شعر پڑھتا تھا ؎

"ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ابتو غصہ میں "دہاڑتے ہو۔ میری جان کوئی دن جاتا ہے کہ موت کی تکلیف میں "دہاڑو گے۔ یہ آدمی بد بلا ہے ہم سے نہ پوچھو"

کچھ سکوت کے بعد چودھری بولے "آج کی پنچایت اچھی ہوگئی۔ بات زیادہ نہ بڑھنے پائی۔ سچ ہے انسان اور انسان کی نسل نہایت عاقل و زیرک ہے۔ گو ہم کو اپنی قوت اور درندگی پر بہت ناز ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ ہی بچہ جو اس وقت ایسا حقیر و ناتوان ہے ایک دن ہمارا قوت بازو بن جاوے اور ضرورت کے وقت ہر طرح کی مدد کرے" بگیرے نے کہا "بجا ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ آئندہ اس بچہ سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے جو منصب حکومت اس وقت قوم کے سردار کو حاصل ہے اُس کو دوام نہیں"

چودھری یہ فقرہ سُنکر پی گیا۔ اور اُس وقت ناگزیر کو سوچنے لگا جو ہر ایک قوم کے سردار کو ایک نہ ایک دن پیش آتا ہے۔ یعنی وہ وقت جبکہ قوت زائل ہوتے ہوتے شکار مارنے کی طاقت نہیں رہتی اور سب بھیڑیئے ملکر سردار کو ہلاک کر دیتے ہیں تاکہ دوسرے کو اُس کا جانشین بنائیں اور جب اُس کا وقت آئے تو اُس کو بھی پھاڑ کھائیں۔ چودھری جب اس فکر سے کسی قدر ہوشیار ہوا تو بھیڑیئے اور اُس کی بیوی سے کہنے لگا "اچھا اب خدا حافظ۔

جاؤ اور اس بچہ کو اچھی طرح تعلیم و تربیت کر کے جنگل کا سورما بناؤ"

غرض اس طرح ہمارا پیارا زُلفی بھالوجی کی سفارش اور بگیرے کی ضیافت سے سیونی کے بھیڑیوں کا بھائی برادر بن گیا۔

اب ہم کو دس بارہ برس آگے بڑھ جانا چاہیے کیونکہ اگر اس زمانہ کے حالات یہاں لکھیں گے تو قصہ طول پکڑ جائے گا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اس عرصہ میں زُلفی کی پرورش بھیڑیئے کے بچوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ یہ بچے تو جلدی سے جوان ہو کر بڑے شکاری بھیڑیئے ہو گئے لیکن ہمارا زلفی ابھی بچہ یا یہ کہو کہ لڑکا ہی رہا۔ تعلیم و تربیت میں ماباپ کی طرف سے کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ ذہن کا ہمیشہ سے تیز تھا۔ تمام صحرائی علوم و فنون جلد سیکھ لئے۔ اور تھوڑے ہی زمانہ میں جنگل کے کاروبار میں بڑا مشّاق ہو گیا۔ یہاں تک کہ رات کے سنّاٹے میں گرم ہوا کے جھونکے پتّوں کا کھڑکا گھاس کی آہٹ۔ سر پر اُلّو کی آواز۔ پانی میں مچھلیوں کی اُچھل کود یا ڈالی پر گرتے ہی چمگادڑ کے اُلٹا لٹک جانے کا مطلب وہ اسی طرح سمجھنے لگا جیسے کوئی پڑھا لکھا آدمی اپنے دفتر کا کام سمجھتا ہے۔ چھُٹّی کے وقت اکثر دھوپ میں پڑے پڑے سو جاتا تھا۔ بھوک پیاس ستاتی تو کچھ کھا پی کر ایک نیند لے لیتا۔ جب گرمی سے جی گھبراتا یا بدن پر میل کاٹنے

لگتی تو کسی پوکھر یا تالاب میں جا کر خوب تیرتا اور خوش ہوتا۔ تنکار کھاتے کھاتے جی اُکتا جاتا تو درختوں پر چڑھ شہد کا چھتّہ توڑ لاتا اور اُس کو خوب مزے لے کر کھاتا۔ شہد کی چاٹ بھالوجی نے لگا دی تھی۔ اِن کا مشہور مقولہ تھا کہ تازے تازے میووں اور شہد کے مقابلہ میں گوشت کی کچھ حقیقت نہیں۔ پاپ بھی ہو۔ دھرم بھی جائے اور خاک مزا نہ آئے۔ زُلفی درخت پر خوب چڑھتا تھا۔ کیونکہ اس فن میں مدتوں بگھیرے کی شاگردی کی تھی۔ بگھیرا کسی اونچے پیڑ کے موٹے سے موٹے ٹھنے پر خوب آرام سے جا بیٹھتا تھا اور پکارتا تھا کہ آؤ بھائی زلفی تم بھی یہاں چلے آؤ جگہ بہت ہے۔ پہلے پہل تو زلفی کو بڑا ڈر لگتا تھا مگر پھر کوئی دن میں ایسی مشق ہو گئی کہ لمبی دُم کے کالے مُنہ والے لنگور بھی جو اس فن کے اُستاد مانے جاتے ہیں اُس کے سامنے کان پکڑنے لگے۔ مہینے کے مہینے پنچایت میں شریک ہوتا تھا۔ اور وہاں خالی بیٹھا بھیڑیوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔ کسی بھیڑیئے کو تاب نہ تھی کہ اُس سے بازی لیجائے بازی تو درکنار ایک پل کسی کی آنکھ نہ ملتی تھی۔ مدتوں زُلفی کو یہی کھیل رہا۔ یار دوست سب اُس کے محتاج رہتے تھے۔ کیونکہ جب کسی کے پنجہ یا پوستین میں کانٹے چبھ جاتے تو یہ ان کو نکال دیتا۔ یا اگر کسی یار کو چچڑیاں ستاتیں تو یہ ایک ایک کر کے چن لیتا۔ کبھی کبھی رات کو بھٹ سے نکل کر پہاڑ کے نیچے جوار باجرے کے کھیتوں میں نکل جاتا اور گنواروں کے

گھر دیکھکر پہلے تو تعجب کرتا اور پھر بیزار ہو کر گھر چلا آتا۔ کچھ عرصہ سے انسان کو وہ بہت بے وفا اور مکار جانور سمجھنے لگا تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ حضرت انسان کی ایک بڑی کاریگری اس کی نظر سے گذری تھی۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ جاڑے کے موسم میں ایک رات بگیرے کے ساتھ گشت کو نکلا۔ اتفاق سے ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جو جانے لگا تو گھاس میں چوہے دان کی قطع کا ایک صندوق جس کا ایک پٹڑا اوپر کو اُٹھا تھا نظر پڑا۔ زُلفی تو اُس کو خاک بھی نہ سمجھا کہ کیا بلا ہے۔ لیکن بگیرے کو اُس کی حقیقت معلوم تھی۔ لیاقت دکھانے کا شوق ایسا چرّایا کہ جھٹ صندوق کے پاس جا اُس کی ترکیب سمجھانے لگا۔ وہ تو خدا نے خیر کردی ورنہ گردن پھنسنے میں کیا باقی رہا تھا۔ اُس دن سے زُلفی کو انسان کے دغاباز ہونے کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ بگیرے کو زُلفی سے بڑا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ اور گرمی کے دنوں میں جب دھوپ بہت ستاتی تھی تو یہ دونوں دور کسی جنگل میں چھاؤں اور ٹھنڈک کی کوئی جگہ نکال کر دن کاٹ دیا کرتے تھے۔ شام ہوتے ہی بگیرا شکار کھیلا کرتا تھا اور زُلفی تماشا دیکھتا تھا کہ بگیرا تھوڑی ہی دیر میں دائیں بائیں شکار مار کر جانوروں کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ زُلفی بھی غضب کا شکاری ہوا تھا۔ کوئی چیز نہ چھوڑتا تھا۔ گائے بیل مارنے کی البتہ اُس کو قسم دلا دی گئی تھی اور بگیرے نے سمجھا دیا تھا کہ "میاں زُلفی۔ سارا جنگل تمہارا ہے جس جانور کو مار سکو شوق سے مار کر تناول فرماؤ لیکن گائے

بیل یا اُس کے بچھڑے بچھیا کو بھولے سے بھی نہ ستانا۔ احسان فراموشی ہم لوگوں میں بھی بڑا عیب ہے۔ یہ ایک جوان خوبصورت بیل کی جان کا صدقہ ہے کہ آج آپ کی صورت چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ جو وہ اپنے خون سے تمہاری جان کا مول نہ دیتا تو بھیڑیے تو ابتک آپ کو کھا پی کر بھول بھی گئے ہوتے۔ زلفی نے ہمیشہ اس نصیحت پر عمل رکھا۔

اب سُنو کہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا زلفی خوب چست و چالاک توانا و مضبوط ہوتا گیا۔ اور سچ ہے جس لڑکے کو مدرسہ یا پاٹ شالے میں بیٹھکر سبق یاد نہ کرنا پڑے اور سوائے شکار کے کسی بات کی دُھن نہ ہو وہ کیوں جلدی ہاتھ پاؤں نکال کر کڑیل جوان نہ ہو جاوے۔

بچے تو سب ہی پیارے تھے لیکن زُلفی پر بی تھرن جان فدا کرتی تھیں اکثر سمجھایا کرتی تھیں کہ بیٹا خدا کے لئے شیرخاں پر کبھی بھروسا نہ کیجیو۔ یہ موذی بڑا دغا باز ہے۔ زلفی گو اپنے تئیں بھیڑیا سمجھتا تھا لیکن پھر آدمی کا بچہ تھا۔ ماں کی نصیحت کو بھول بھول جاتا تھا۔ شیر سے رستہ میں کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ زلفی نے چاہا بھی کہ صاحب سلامت پیدا کرے لیکن شیر ہی نے مُنہ نہ لگایا۔ اب کچھ عرصہ سے شیر کی آمدورفت اس طرف زیادہ رہنے لگی تھی وجہ یہ تھی کہ چودھری بھیڑیوں کا سردار بہت بوڑھا ہو چلا تھا اور نئی پود کے بھیڑیے اب اُس کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ شیرخاں نے اس موقع کو غنیمت

جانا اور جوان بھیڑیوں سے رسم پیدا کرنی شروع کی۔ کم سنی میں عقل تو کچی ہوتی ہی ہے اکثر نادان بھیڑیے کل کی پیدائش بچے کچھے شکار کی لالچ میں شیر خاں کے ساتھ رہنے لگے۔ چودھری کا ضعف اب اس حد کو پہنچا تھا کہ وہ اپنے اختیارات کو پورے طور پر عمل میں نہ لا سکتا تھا اور نہ اُس کو یہ ذلت کب گوارا ہو سکتی تھی کہ ایک آزاد قوم کے نوجوان بے غیرت بنکر شیر خاں کی غلامی کو اعزاز کا تمغہ سمجھیں شیر کا اب یہ وتیرہ تھا کہ جوان بھیڑیوں کو چاپلوسی کی باتوں سے گمراہ کرتا تھا۔ اور تاسف کر کے اُنسے کہتا تھا " ارے بدنصیبو! یہ تمہاری جوانی۔ یہ پھرتی۔ یہ صیادی اور پھر کیا خدا کی پھٹکار ہے کہ ایک بوڑھے مرنہار بھیڑیے اور ایک دو ٹانگ کے پلے یعنی آدم زاد کی غلامی کرتے ہو۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ اس آدمی کے لڑکے سے تم چار آنکھیں تک نہیں کر سکتے۔ آفریں ہے اُن کی آدمیت پر اور حیف ہے تمہاری گرگیت پر کہ ایسے کمزور جانور سے ایک پل آنکھ نہ ملا سکو " بھیڑیے یہ ملامت سُنکر سخت شرمندہ ہوتے تھے اور غیرت کے مارے گردنیں پھلا پھلا کر غرانے لگتے تھے۔

بگیرا جس کی فہم و فراست جنگل مشہور تھی یہ سب خبریں سُنتا رہتا تھا۔ زلفی کو بار بار سمجھاتا تھا کہ دیکھو صاحبزادے۔ ہوشیار رہنا۔ ایک نہ ایک دن یہ شیر خاں تم کو چٹ کر جائینگے۔ زلفی سُنکر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ تمہارے اور برادری کے ہوتے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر چا لوجی میرے موٹے گرو بھی تو

ہیں۔گو اُن کو خور و خواب سے مہلت کم ملتی ہے لیکن میری حمایت میں تو وہ بھی بھوں بھوں کر کے دو چار ٹکّے ٹکا ہی دینگے"۔

اب ایک دن کا ذکر سُنئے۔جب دن چڑھے گرمی زیادہ ہوئی تو بگیرا اور زلفی باتیں کرتے ہوئے دُور ایک بن میں جا نکلے۔درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں دیکھکر ایک ستھری سی جگہ بیٹھ گئے۔زلفی بگیرے کی نرم گردن پر سر رکھکر لیٹ رہا۔بگیرا بالکل چُپ تھا اور اکثر آنکھیں بند کر کے دایاں پنجہ چاٹنے لگتا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ بہت فکرمند ہے۔زلفی کو چھاؤں ایسی بھلی لگی کہ آنکھ جھپکنے لگی۔بگیرے نے سوچتے سوچتے زلفی کو ہوشیار کیا۔اور کہا"زلفی زلفی بار بار کہہ چکا ہوں کہ شیر تمہارے خون کا پیاسا ہو گیا ہے مگر تم کو مطلق خیال نہیں۔دیکھو اگر تم اس بات کو نہ پہونچے تو سخت پچھتاوگے"۔

زلفی نے آنکھیں کھولکر کہا"بار بار کہنا کیسا۔آپنے تو یہ بات اتنی دفعہ کہی ہے کہ سامنے کی جھاڑی پر اتنے بیر بھی نہونگے (زلفی کو گنتی کہاں آتی تھی کہ ٹھیک ٹھیک بتاتا) پر اس وقت اس ذکر کی کیا ضرورت تھی۔میرا تو نیند کے مارے بُرا حال ہے۔آپ کو شیرخاں کی پڑی ہے۔وہ تو یونہیں بکا کرتا ہے۔نام کو تو شیر ہے پر سوا مور کی طرح اترا اترا کر ناچنے اور چنگھاڑنے کے اُس کو آتا ہی کیا ہے۔

بگیرا"ذرا اُٹھکر بیٹھو۔یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔کچھ خبر بھی ہے

پہلے تو شیر دل ہی دل میں تمہارا دشمن تھا۔ لیکن اب اس کی عداوت کسی پر پوشیدہ نہیں۔ مجھے تو شروع ہی سے ایک ایک بات کا علم ہے۔ اب بھالو جی کو بھی خبر لگ گئی ہے۔ بھیڑیوں میں بچہ بچہ کی زبان پر یہی قصہ ہے۔ جنگل میں جگہ جگہ اسی کا چرچا ہے۔ چرند پرند کون نہیں جانتا۔ دور کیوں جاؤ۔ وہ سامنے درختوں کی اوجھل جو ہرنوں کی بھولی بھولی ڈاریں چر رہی ہیں۔ ان تک کو شیر کی عداوت کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ خود طباقی نے کئی دفعہ صاف صاف تمہارے منہ پر کہا۔ پر افسوس تمہارے کان پر جوں نہ چلی؛

زلفی ”واہ وا۔ یہ تو آپ نے خوب یاد دلایا۔ طباقی کا حال تو میں نے آپ سے کہا ہی نہیں۔ ایک دن اس بے غیرت نے مجھے ننگا دھڑنگا پا کر چھیڑا۔ مجھے بھی غصہ آیا دوڑ کر دم پکڑ لی۔ اور ادھر اٹھا کر اتنی چک پھیریاں دیں کہ یاد ہی کرتا ہوگا۔ جب بہت کھینچا چلایا تو دھائیں سانی ایک درخت سے دے مارا۔ دور جا کر پڑا۔ اور دو چار لڑکنیاں کھا۔ سیدھا ہو ٹاؤں ٹاؤں کرتا اس زور سے بھاگا کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے؛“ زلفی اتنا کہہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

بگیرا ”بڑی بیوقوفی کی حرکت تھی۔ طباقی بڑا حرفوں کا بنا ہے۔ اسکو یار بنا لیتے تو بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتیں۔ یہ بڑی نادانی تھی کہ اسکو مار کر بھگا دیا۔ پھر سو سوئے جاتے ہو۔ ذرا سنبھل کر اپنے سہارے بیٹھو۔ بات

یہ ہے کہ اس جنگل میں تو کسی کی مجال نہیں کہ تم کو ہاتھ لگا سکے۔ لیکن مشکل یہ
بنی ہے کہ چودہری بڈھا ہو چلا ہے۔ اور اب کوئی دن جاتا ہے کہ اُس سے
شکار نہ مارا جائیگا۔ جس دن یہ نوبت آئی اُسی دن برادری والے اُس کی
چودہرات چھین لینگے۔ تم کو تو کیا خاک یاد ہوگا۔ دودھ پیتی جان تھے۔ دس
برس سے زیادہ کا زمانہ گذرتا ہے کہ جس وقت تمہارے بھیڑیئے اماں باوا نے
تمہیں بچوں کے سامنے لا کر ڈالا تو بہت سے بھیڑیوں کو تمہارا غول میں شریک
ہونا ناگوار ہوا۔ وہ بھیڑیئے اب تک جیتے ہیں جو اُس وقت جوان تھے۔ اب
بڈھے ہیں اور جو بچّے تھے وہ جوان ہو کر شیر کے چیلے بنے ہیں اور تمہارے
خون کے پیاسے اور گوشت کے بھوکے ہیں"

زلفی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں وہ کونسا نقص ہے کہ بھیڑیئے
مجکو اپنی برادری سے نکال دیں۔ اسی جنگل میں پیدا ہوا۔ یہیں پرورش
پائی۔ ہمیشہ بھائیوں کی خدمت کی۔ جس بھائی کے پنجہ یا پوستین میں کانٹے
چبھے وہ نکالے۔ چچڑیاں چھڑائیں۔ سب طرح کا دُکھ درد کیا۔ پھر مجھ سے دشمنی
کرنے کا کیا سبب ہے۔ وہ میرے بھائی ہیں۔ میں اُن کا بھائی ہوں
دشمنی بیچ میں کیونکر آن کودی"

بگیرا اتنا سنتے ہی ٹھنڈی زمین پر ہاتھ پاؤں پھیلا چت لیٹ گیا
اور منہ اونچا کر کے سر پیچھے کو ڈالکر کہنے لگا "بھائی زلفی ذرا میرے جبڑے

کے نیچے گردن میں ہاتھ ڈالکر دیکھو تو یہ کیا چیز ہے"۔

زلفی نے اپنا سوکھا سخت لکڑی سا ہاتھ بگیرے کی گردن میں ڈالکر ٹٹولنا شروع کیا تو ٹھوڑی کے نیچے جہاں ریشم سے نرم بالوں میں گردن کے مضبوط رگ و پٹھے پوشیدہ تھے ایک جگہ معلوم ہوا کہ جلد پر سے بال اُڑ گئے ہیں اور کھال موٹی پڑگئی ہے۔ جب زلفی کا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے پہونچ لیا تو بگیرے نے کہا "بھائی زلفی اس جنگل میں سوائے میرے کوئی نہیں جانتا کہ بگیرے کی گردن میں کوئی نشان ہے اور نشان بھی کس چیز کا۔ طوق کا۔ سُن پیارے زلفی میں وہ ناشاد نامراد بگیرا ہوں جو انسان کے گھر میں پیدا ہوا جس کی ماں راجستان کے ایک راجہ کے محل میں مدتوں قید میں رہکر مری رانیوں اور راجکماریوں کی مصاحبت میں زندگی عیش و آرام سے بسر ہوئی مگر قید پھر قید تھی۔ لوہے کے پنجروں میں زندگی کا بڑا حصہ گذرا۔ سلاخوں میں سے ہمیشہ کھانا ملا۔ لوہے کے تسلے سے ہمیشہ پانی پیا۔ قید میں صحرا کے چشمے اور جنگل کا ہریاول کہاں۔

غرض اس حالت اسیری میں انسان سے طبیعت مانوس ہوگئی اور یہ ہی باعث تھا کہ آج سے دس برس پہلے اور آج تک تیری جان بچانے میں کبھی کسی بات سے دریغ نہیں کیا۔ لیکن خیر۔ اس کا ذکر فضول ہے۔

اپنا قصہ مختصر یہ ہے کہ زندان ہی میں پیدا ہوئے اور زندان ہی میں

پروان چڑھے۔ جنگل کی صورت کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی۔ یہاں تک کہ ایک رات طبیعت بہت گھبرائی اور خود بخود خیال آیا کہ اے بدنصیب ماں کے بدنصیب بچے تو بھر بگیرا ہے آدمی کا کھیل نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی کچھ ایسا جنون سوار ہوا کہ ایک ہی پنجہ میں قفل زندان کو توڑ ڈالا اور جنم قید سے اپنے کو آزاد کیا۔ جس وقت جنگل میں پہونچا تو یہاں لوگوں نے شیر سے بھی زیادہ میرا خوف کیا۔ کیونکہ میں نے آدمیوں میں رہکر انسان کی عقل سیکھی تھی۔"

زلفی نیند کا ماتا تو ہو ہی رہا تھا۔ کہانی سُنتے سُنتے بالکل سو چلا۔ لیکن جب بگیرا چپ ہوا تو آنکھیں بند کی بند مُسکرا کر کہنے لگا "جنگل والوں نے آپ سے خوف کیا ہوگا۔ میں تو آپ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

بگیرا زلفی کی اس بھولی بھالی بات پر بے اختیار ہنس دیا اور بولا "تیری بلا جانے ڈر کسکو کہتے ہیں۔ آخر انسان کا پوت ہے۔ جانور تو نہیں ہے۔ خیر ذرا اُٹھکر بیٹھو۔ اس ذکر کو اس لئے چھیڑا تھا کہ میں جنگل کا جی تھا آخر کار جنگل میں پہونچ گیا۔ تو انسان ہے اگر بھیڑیوں سے جان سلامت بچ گئی تو تو بھی ایک دن اپنے ہمجنسوں میں جا کر آباد ہو جائیگا۔"

زلفی "یہ سب کچھ سہی۔ پر بھیڑیوں سے کیوں میری جان سلامت نہ بچیگی"

بگیرا "ذرا اُٹھکر میری طرف دیکھو تو بتاؤں۔ زلفی نے اُٹھکر بگیرے سے آنکھیں ملائیں۔ ایک لمحہ نہ گذرا تھا کہ آنکھیں جھپک جانی تو درکنار وہ شیر کا سا کلّہ اور

بھاری بھرکم گردن تک دوسری طرف کو پھر گئی۔

بگیرے نے نشست بدلکر زمین پر زور سے پنجہ مارا اور کہا "اب بھی سمجھے کہ عداوت کا کیا سبب ہے۔ میں بگیرا ہوں۔ آدمیوں میں پلا ہوں۔ تمہارے ساتھ غایت درجہ اُنس رکھتا ہوں۔ پھر یہ حال ہے کہ ایک پل تمہاری آنکھوں کے سامنے اپنی نظر نہیں ٹھیرا سکتا۔ بس یہ ہی تمہاری نظر کے سامنے کسی کی نظر کا نہ ٹھیرنا۔ دوسروں سے عقل میں تمہارا زیادہ ہونا ہمدرد بنکر بھیڑیوں کے تلووں سے خار کھینچنے یہ ہی عداوت کے اسباب ہیں۔ فقط تمہارا انسان ہونا اُن کی عداوت کی دلیل ہے"

مُولفی کی تیوری پر بل پڑتے ہی کالی کالی چھوٹی بھوؤں کے نیچے دیدے سُرخ ہوگئے اور آزردہ ہوکر بولا "بھائی میرے مجھے ان باتوں کی کیا خبر تھی۔ بھلائی کرو برائی ملے۔ یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی"

بگیرا۔ "ہاں پیارے مُولفی جنگل کا یہی دستور ہے۔ پہلے پنجہ۔ پھر زبان۔ چھوٹتے ہی طمانچہ رسید کرو۔ پھر بات سو بات۔ تمہاری اس بے پرواہی کا تو رونا ہی۔ جس سے ظاہر کہ آخر پھر ہو تو انسان ہو۔ پر اب اتنے بڑے ہوئے سمجھ سیکھو۔ اپنی برائی بھلائی دیکھو۔ اس دفعہ اگر چودہری سے شکار چھوٹ گیا اور بارہ سنگا نہ مر سکا تو بس سمجھلو کہ تمہارا قصہ بھی تمام ہوا۔ ساری برادری تم پر اور چودہری پر ٹوٹ پڑیگی۔ پھر جان بچنی ناممکن ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس

دفعہ کاشتکار چودہری کے بس کا نہیں ہے۔ اُس غریب کا حال تم جانتے ہی ہو پہلے تو خیر گُٹلیاں ہی ہلتی تھیں اب پنجوں میں ناخن بھی بیکار ہو چلے ہیں۔ شکار چھوٹتے ہی دوسرے دن پنچایت بیٹھ جائیگی اور سردار کو ہلاک کرتے ہی تم کو بھی تِکا بوٹی کر دیا جائیگا۔ لیکن خیر تمہاری محبت نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہم سے جو بن پڑے گا۔ کرینگے۔ اور ایک بات ہو جاوے تو واہ وا کیا کہنا ہے۔ اتنا کہتے ہی بگیرا جوش میں آ زمین سے چار ہاتھ اُونچا اوچھل گیا اور خوش ہو کر بولا "پوچھو وہ کیا بات ہے" زلفی نے حیران ہو کر کہا "آپ ہی فرمایئے میری سمجھ سے باہر ہے"

بگیرا "بات کچھ نہیں ہے۔ ذراسی تکلیف کرو۔ اُٹھو۔ اور پہاڑ کے نیچے آدمیوں کی بستی میں چلے جاؤ۔ اور گھروں میں چپکے چپکے جھانکتے پھرو۔ جہاں کہیں کسی جھونپڑی میں تم کو لال لال دہکتے ہوئے پھول نظر آئیں اُن کو چُن کر کسی چیز میں لے آؤ۔ پھر بہار دیکھنا کہ اِن سُرخ گل بوٹوں سے جو کام نکلے گا وہ نہ بگیرے کی دوستی کام دیگی نہ بھالو کی خیر خواہی۔ بس ابھی سے چلدو۔ دیر نہ لگاؤ"

لال لال پھولوں سے بگیرے کی مُراد آگ تھی۔ جنگل کے سب جانور آگ سے ایسے ڈرتے ہیں کہ اُس کا نام نہیں لیتے۔ اور اور بہت سے نام ایجاد کر رکھے ہیں جو آگ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

زلفی ''لال پھول۔ اچھا وہ چیز جو کبھی جھونپڑیوں کے باہر کبھی اندر سورج ڈوبتے ہی چمکا کرتی ہے۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ابھی لو''

بگیرا۔ کیوں نہ ہو۔ آخر آدمی ہے۔ تیرے برابر زود فہم کون ہوسکتا ہے پر زلفی جاتے تو ہو۔ اتنا خیال رکھنا کہ ان پھولوں کے آس پاس ہی کہیں کوئی مٹی کی ہنڈیا پڑی ہوگی۔ ایک ہنڈیا اُٹھا کر جلدی جلدی پھول چنکر اُس میں ڈالدینا نہیں تو وہ کاٹ لینگے یہ پھول کانٹوں سے بھی زیادہ تیز ہوتے ہیں''

زلفی۔ ''اچھا تو لیجئے میں چلا۔ پر میرے پیارے بگیرے'' اور اتنا کہہ زلفی نے بگیرے کی خوبصورت نرم گردن میں باہیں ڈالدیں ''پیارے بگیرے۔ اتنا بتا دو کہ کیا یہ سب کرتوت شیر خاں کے ہیں''

بگیرے کے آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگا ''پیارے زلفی۔ قسم ہے اُس قفل زندان کی جس نے اسیری سے آزاد کیا کہ یہ ساری مصیبت شیر خاں تمہارے سر پر لایا ہے''

زلفی۔ تو بس مجھے بھی سوگند ہے اُس جاں دار کی جس نے اپنے خون سے میری جان کا مول دیا ہے کہ شیر خاں میرے ساتھ کچھ نہ کرسکا جو میں اُسکے حق میں کرونگا'' اتنا کہہ زلفی یہ جا وہ جا۔

زلفی جونہیں درختوں کی اوجھل ہوا۔ بگیرے نے بڑے درد سے کہا۔ ''ارے انسان ارے انسان۔ تجکو خدا نے عجب مخلوق بنایا ہے۔ تیرا کوئی

کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ افسوس تو اس کالی دھاریوں والے احمق کا ہے۔ او بدنصیب شیر شکار تو تو نے بہت مارے پر آج سے دس برس پہلے اس آدم زاد کا شکار ترے حق میں پیغام اجل ہو گیا۔

زلفی دیر تک بَن میں دوڑتا ندی نالے تیرتا پھاندتا شام ہوتے گھر پہونچا۔ بھٹ کے پاس کچھ دیر دم لیکر اندر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ بھائی سب شکار کو نکل چکے تھے۔ اماں البتہ بھٹ کے پیچھے خاموش بیٹھی تھیں۔ زلفی کو ہانپتے دیکھکر سمجھیں کہ آج بچہ کچھ پریشان ہے۔ پوچھنے لگیں "بیٹا خیر ہے۔ آج ایسے سراسیمہ کیوں ہو"

زلفی "جی کچھ نہیں۔ شیر خاں کی شُتر گُربگیوں نے جان غضب میں دیدی ہے۔ آج ذرا کھیتوں میں شکار کھیلنے جاتا ہوں۔ اتنا کہہ جھاڑیوں کو کودتا پھاندتا پہاڑ سے اُتر کر ندی کے کنارے آیا۔ چاہتا تھا کہ قدم تیز کر کے کھیتوں میں اُترے کہ ایک دفعہ ہی بہت سے بھیڑیوں کا شور سُنا۔ شور سُنتے ہی زلفی کے پاؤں ایک ایک من کے ہو گئے۔ گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ کہ ایک جوان مست بارہ سنگا کچھ دور ندی کے کنارے ایک اُونچے ٹیلے پر ہر طرف سے گھرا کھڑا ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے اور کان کھڑے کئے پھنکارے مارتا ہے۔ چاروں طرف گھبرا گھبرا کر نظر ڈالتا ہے کہ کہیں رستہ ملے تو چار چوکڑیوں میں دشمن کی زد سے کہیں کا کہیں نکل جاوے مگر ہر طرف

بھیڑیوں کے غول ہوشیار کھڑے ہیں۔ زلفی دل میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں سب بھیڑیئے ملکر چلّائے "چودھری کدھر ہے چودھری کو لاؤ۔ شکار کو گھیر لیا ہے۔ آئے اور اس بارہ سنگے کو مارے نہیں تو......

اتنا کہنے نہ پائے تھے کہ چودھری آیا اور دو چار ریکر کاٹ کر بارہ سنگے پر گرا۔ چودھری کو دیکھتے ہی زلفی اس قصہ کو سمجھ گیا اور اس زور سے بھاگا کہ تھوڑی ہی دیر میں بھیڑیوں کا شور اُس کے کانوں میں ہلکا ہوتے ہوتے بالکل جاتا رہا۔ زلفی اتنا ضرور سمجھ گیا کہ چودھری کا وار خالی گیا۔ آخر کار بھاگتے بھاگتے کسانوں کے گھر تک پہونچ گیا۔ اور ایک جھونپڑی کے پیچھے پولیوں کے ڈھیر میں چھپ کر ہو بیٹھا۔ اور دل میں کہنے لگا کہ بگیرا سچ کہتا تھا کہ کل کا دن میرے اور چودھری کے حق میں قیامت سے کم نہوگا۔

جب ذرا دم قابو میں آیا تو کھڑے ہو کر دیوار کے موکھے میں سے جھونپڑی کے اندر جھانکنے لگا۔ دیکھا ایک طرف الاؤ لگا ہے۔ کسان کی جورو گھڑی گھڑی اُٹھتی ہے اور کوئی کالی کالی چیز اُس میں ڈالدیتی ہے۔ زلفی رات بھر یہ ہی تماشا دیکھتا رہا۔ جب صبح ہونے میں تھوڑی رات باقی رہی تو کسان کا لڑکا اُٹھا اور ایک ہنڈیا میں آگ بھر کر دروازہ کی طرف چلا۔ زلفی بھی اُسی دروازہ کی طرف ایک چھلانگ میں آیا۔ لڑکے نے جوہیں پٹ کھولکر نکلنا چاہا زلفی نے بھپکی سُنائی اور ہنڈیا اُس کے ہاتھ سے چھین چلتا بنا۔

لڑکا پہلے تو ڈر کے مارے سہما کا سہما رہ گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو دُہائی مچانے لگا۔ زُلفی اتنی دیر میں کہیں کا کہیں پہونچا تھا۔

جب بستی سے دور جنگل میں نکل آیا تو جس طرح کسان کی بیوی کو آگ پھُونکتے دیکھا تھا خود بھی اُسی طرح آگ پھونکنے لگا۔ اور دل میں کہتا جاتا تھا کہ گاؤں کے جانوروں کی صورت شکل مجھ سے بہت ملتی ہے "اُوہو ارے رے رے۔ یہ پھول تو مر چلے۔ کہیں ان کو بھوک تو نہیں لگی۔ کچھ کھلانا چاہیے" یہ کہہ ہنڈیا زمین پر رکھ بہت سی سوکھی پتیاں ٹہنیاں چُن کر آگ میں ڈال دیں۔ اور ہنڈیا اُٹھا بھاگنا شروع کیا۔ پہاڑ پر آدھی دور چڑھا تھا کہ ایک طرف سے سُورج نکلا اور بگیرا سامنے کھڑا نظر آیا۔ ریشم کی سیاہ پوستین پر شبنم کی صاف شفاف بوندیں ایسی چمکتی تھیں گویا بال بال موتی پروئے ہیں۔

بگیرا زلفی کو دیکھتے ہی بولا۔ "رات کا قصہ سُن لیا۔ چودھری سے شکار نہ ہو سکا۔ غول والے تو کل رات ہی کو اُس غریب کا فیصلہ کر دیتے۔ پر تمہارا ہونا بھی ضرور تھا۔ رات بھر بھیڑیوں نے تم کو ڈھونڈا ہے۔ سارا پہاڑ چھان مارا۔ پچھلے پہرے سے ذرا تھک کر بیٹھے ہیں"

زلفی "میں پہاڑ میں کیونکر ملتا۔ ڈھونڈھنے کی ایسی کیا ضرورت تھی۔ اب آجائیں دیکھوں تو کیا کر لیتے ہیں" اتنا کہہ زلفی نے آگ کی ہنڈیا

بگھیرے کے سامنے رکھدی اور کہنے لگا "اور فرمائیے کیا حکم ہے" بگھیرا ہنڈیا کو دیکھتے ہی دو قدم ہٹ کر بولا "شاباش میاں زُلفی۔ شاباش۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

لیکن ذرا اتنی احتیاط رہے کہ پھول کُملا نہ جائیں۔ انسان تو ان پھولوں میں درختوں کی سوکھی شاخیں ڈالا کرتے ہیں اور اُنکے پڑتے ہی شاخوں پر طرح طرح کے سُرخ پھول اور پتّے نکل آتے ہیں۔ زلفی اتنے نہ جھکو۔ تم کو تو بالکل ڈر نہیں لگتا" زلفی بولا "اسمیں ڈرنے کی کونسی چیز ہے مجھے تو اب یاد آیا۔ بہت دنوں کا ذکر ہے۔ جب میں بھیڑیا نہ تھا۔ تو ایک دن ایسے ہی لال پھولوں کے پاس پڑا کھیلتا تھا۔ اور بڑی بڑی بہار کے پھول پتّے کھل رہے تھے"

زُلفی بگھیرے سے رخصت ہو صبح سے شام تک آگ کی ہنڈیا کو بھٹ میں لئے بیٹھا رہا۔ کسی درخت کا ایک سوکھا سا جھاڑ توڑ کر بھٹ میں گھسیٹ لایا تھا اور اُسی کے چھال پتیاں۔ ٹہنیاں توڑ توڑ کر آگ میں ڈالتا تھا۔ جب شعلے اُونچے ہوتے تھے تو خوب خوش ہو ہو کر کبھی قلا بازیاں کھانے لگتا تھا۔ کبھی ناچتا تھا۔ کبھی کودتا تھا۔ غرض سارے بھٹ کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ جب اسی کھیل میں دن کٹ گیا تو شام ہوتے ہی طباقی بڑے اینٹھتے ہوئے بھٹ کے دروازہ پر آئے اور مُنہ اونچا کرکے پُکارنے

لگے۔ ابے او آدمی کے پلّے ہوت۔ ابے او ننگے دُھڑنگے لونڈے ہوت سُنتا ہے۔ نیچوں میں تیری پُکار پڑی ہے۔ بس اُٹھ اور سیدھا ہو چل۔ نہیں تو ناک پر کاٹ کھاؤنگا" زلفی آگ سے کھیلنے میں خوش تو بیٹھا ہی تھا گیدڑ کی آواز سُنتے ہی اس زور سے قہقہہ لگایا کہ گیدڑ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور دُم دبا کر اس زور سے بھاگا کہ کسی کی نہ سُنی۔ زلفی بہتیرا چلایا کہ "اجی چوبدار صاحب۔ سُنئے تو۔ ذرا تو دم لیجئے" مگر چوبدار صاحب کو اس عرصہ میں پہلی چابک بھیریاں یاد آگئی تھیں۔ دورانِ سر کی شکایت ابھی تک باقی تھی۔ پسلیوں کی دُکھن اور دُم کی سوجن کو ابھی تک پورا آرام نہیں ہوا تھا۔ اس حال میں وہ کسکی سُنتے تھے۔ غرض جب گھڑی بھر رات گئی تو زلفی نے آگ کی ہنڈیا اُٹھائی اور بیچ پربت پر پہونچا۔ ابتک ہنسی کے مارے یہ حال تھا کہ رستے بھر قہقہے لگاتا پیٹ پکڑے پکڑے گیا۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہونچکر دیکھا کہ آج چودھری چٹان پر نہیں ہے۔ بلکہ چٹان کے نیچے ایک طرف کو بہت دلگیر بیٹھا ہے۔ یہ گویا علامت تھی کہ آج بھیڑیوں کی سرداری کا عہدہ خالی ہے۔ سامنے شیر خاں دس بیس جوان بھیڑیوں کو لئے جو جھوٹا شکار کھا کھا کر خوب چکنے چپڑے ہو گئے تھے ٹہل رہے ہیں۔ خوشامد کا بازار گرم ہے۔ بجا و درست۔ جی حضور اور جو حکم

کی صدائیں بلند ہیں۔ زُلفی جھکے سے آگ کی ہنڈیا لئے ایک طرف بگیرے کے پہلو میں ہو بیٹھا۔ جب پوری پنچایت جُڑلی تو شیر خاں ٹہلتے ٹہلتے ایک جگہ ٹھیرے اور ارادہ کیا کہ پنچایت کے سامنے گفتگو شروع کریں۔ تقدیر کی بات دیکھئے کہ شیر اور سیونی کے آزاد بھیڑیوں کے سامنے بلا اجازت مُنہ سے بات نکالنے کی جرأت کرے۔ آج کو چودھری میں دم ہوتا، تو بھلا کسی کو اتنی ہمّت ہو سکتی تھی۔

بگیرے نے شیر کی نیت دیکھتے ہی زُلفی کے کان میں کہا۔

"زُلفی۔ زُلفی۔ دیکھو شیر کو اس مجمع میں گفتگو کا حق حاصل نہیں ہے۔ ذرا کھڑے ہو کر اتنا کہدو کہ یہ شیر شیر کا بچّہ نہیں ہے۔ بلکہ کتّے کا جنا ہے۔ پھر دیکھو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔" زُلفی فوراً کھڑا ہوا اور بولا "اے آزاد بھیڑیو۔ کیا اب شیر کو اپنا سردار بناؤ گے۔ اگر ایسا قصد ہے تو حیف ہے تمہاری عقل پر۔"

شیر نے زُلفی کی طرف توجہ نہ کی اور بولا "بھیڑیو۔ چونکہ اس وقت تک غول کا کوئی سردار مقرر نہیں ہوا ہے۔ اور مجھ سے اس جلسۂ عام میں تقریر کرنے کی درخواست کی گئی ہے اس لئے میں . . . . .

زُلفی بیچ میں بول اُٹھا "وہ کون ہے۔ جس نے تجھ سے ایسی درخواست کی ہے۔ کیا ہم اب بھیڑیوں سے گیدڑ ہو گئے ہیں کہ تجھ قصائی کی خوشامد

کرینگے۔ غول کے سردار کو غول والے ہی انتخاب کرینگے۔ تو دخل در معقولات
دینے والا کون ہوتا ہے"۔

زُلفی کی اِس بات پر خوشامدی بھیڑیوں میں ہر طرف غل پڑا اور
آوازیں آئیں "او آدمی کے بچّے خاموش۔ او بے دُم کے جانور
زبان بند کر۔ شیر خاں کو سب کچھ اختیار ہے۔ وہ جو چاہے سو کہے"
یہ آوازیں سُنتے ہی جتنے بھیڑیئے تھے سب چلّانے لگے۔ اور ایسا طوفان
بے تمیزی برپا ہوا کہ برادری کے بڑے بوڑھے مُنہ پھاڑ پھاڑ کر پچھلے
پنجوں پر پورے قد سے کھڑے ہو گئے اور چلّائے "خاموش خاموش"
جب ذرا غل کم ہوا تو ایک نہایت مُسن واجب التعظیم بھیڑیا کسی قدر
تکلف سے اُٹھا اور بولا "بھائیو بھائیو۔ کُتّوں کی طرح لڑنے سے کیا حاصل
مرے بھیڑیئے کی بات پہلے سُن لو" مرے بھیڑیئے سے مراد چودھری
تھا کیونکہ بھیڑیوں میں جبتک کوئی سردار معزول ہو کر ہلاک نہیں کر دیا
جاتا اُس کو مرا بھیڑیا کہتے ہیں۔ اور حقیقت میں وہ مَرے سے بدتر ہوتا ہے
دو چار دن سے زیادہ اُس کو کوئی نہیں جینے دیتا۔

اب چودھری نے اپنا بوڑھا سفید سر خاکِ ذلت سے اُٹھایا اور
بہ آوازِ حزیں کہنا شروع کیا "اے دشتِ سیونی کے آزاد بھیڑیو!
میرا خطاب صرف تم ہی سے ہوتا لیکن مجبور ہوں کہ اُن بے غیرتوں

تو بھی اسمیں شامل کروں جو ننگ قوم ہو کر شیر کے غلام اور چیلے بنے ہیں
حقیقت میں وہ اب بھیڑیئے نہیں رہے بلکہ گیدڑوں سے بھی زیادہ
ناپاک اور ذلیل ہیں۔ آج کچھ اوپر بارہ برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ اس
غول کی سرداری میرے ذمہ رہی۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا
اس مدت دراز میں آپ صاحبوں میں سے کسی کو کسی طرح کی تکلیف
یا گزند نہ پہونچنے دی۔ نہ کوئی جال میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ نہ کوئی چٹخنی
میں پھنسکر زخمی یا زندہ قید ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا کہ جس وقت بارش
کی قلت سے شکار کی کشش ہوئی تو بہتر سے بہتر مشورہ لیکر اور سہل سے
سہل موقعے شکار کے تلاش کر کے کف دست صحراؤں اور دشوار
گذار وادیوں میں اسی غول کی قافلہ سالاری میں اپنی جان کو جان نہ سمجھا
اور کسی بھائی کو بھوک کی تکلیف سے مرنے نہ دیا۔ اب البتہ بڑھاپے نے
معذور کردیا اور تمام عمر میں کل رات کو یہ پہلا موقع تھا کہ شکار پر چلا اور
وار خالی گیا۔ آپ سے بڑھکر کون جانتا ہے کہ میری ضعیفی ہی اس ذلت کا
باعث نہیں ہوئی ہے بلکہ بھائیوں نے رسوا کرنیکے لئے سازش کی اور
ایک ایسے ناکندہ جانور کو گھیر کر لائے جو اس وقت تک کسی درندہ
کے حملہ سے آشنا نہ تھا۔ خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا اور ایک دن یہ ہی ہونا
بھی تھا۔ اب بھائیوں کو اختیار ہے کہ اسی پنچایت کے سامنے مجھے

ہلاک کر دیں۔ ایک ایک بھائی۔ اُٹھے اور مجھ سے لڑے۔ یا وہ مجھے مار ڈالے یا خود اپنی جان موت کے حوالہ کرے۔ جو قاعدہ ہے اُس پر عمل ہونا چاہیئے"

یہ متین و سنجیدہ تقریر سُنکر تو سب خاموش رہ گئے۔ معزول چودہری سے تنہا کُشتی لڑ کر اُس کو جان سے مارنے کی ہمت کسی میں نہ تھی جب کوئی بھیڑیا نہ اُٹھا تو شیر خاں ایک دفعہ ہی مُنہ اونچا کر کے دھاڑے۔

"بھائیو۔ اس بوڑھے پوپلے ناخن ٹوٹے احمق کا کیا ہے۔ آج نہ مرا کل مارا جائیگا۔ اصل فساد کی جڑ تو یہ آدمی کا پلّا گول سر کا جانور ہے۔ اب یہ بہت جی لیا۔ کچھ آج سے نہیں دس دس برس سے ہم اسکے فراق میں دانت تیز کر رہے ہیں"

اے آزاد بھیڑیو۔ اب اس آدم پرستی سے باز آؤ۔ برسوں سے اس منحوس نے جنگل کو ستا رکھا ہے۔ اب کچھ تامل نہ کرو۔ اور اُسکو ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ سمجھ لو کہ ان ہی پہاڑیوں میں بود و باش اختیار کر کے رات دِن طرح طرح کے شکار نہایت لذیذ اور فربہ تمہارے سامنے مار مار کر کھاؤنگا اور حصہ بخرہ تو درکنار اُلٹے پنجے سے بچی کچھی ہڈی تک تمہاری طرف نہ پھینکونگا۔ یہ انسان ہے اور انسان وہ حیوان ہے جس سے جنگل کے رہنے والوں کو بغض للہ رکھنا واجب بلکہ فرض ہے"

یہ سُنکر بہت سے پنچ بول اُٹھے "سچ تو ہے۔ اس بلا کو دور بھی

کرو۔ جہاں کا ہے وہیں جانے دو۔"

شیرخاں۔ "واہ جہاں کا ہے وہیں جانے دو کی بھی خوب کہی۔ چوروں کو گھر دکھا کر دھن لٹوا دو۔ گنواروں کو دشمن بنا کر جنگل میں آئے دن قیامت برپا رکھو۔ تدبیر بھی نکالی تو کیا خوب نکالی۔ ارے نادانو۔ سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ اسکو میرے سپرد کر دو۔ ہزاروں دفعہ کہہ چکا ہوں کہ انسان بُری بلا ہے جس سے تم ایک پل آنکھ نہ ملا سکو اُسکو اب بھی اپنا دوست سمجھے جاؤ تو بس رونا چاہیئے تمہاری اس نادانی پر۔"

چودھری نے پھر ہمت کر کے سر اُٹھایا اور بولا "بھیڑیو۔ بھیڑیو۔ یاد رہے۔ یہ وہ لڑکا ہے جس نے ہماری قوم کے ایک نہایت معزز خاندان میں پرورش پائی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارے دُکھ درد میں شریک رہا ہے۔ اُس کی خدمتوں کو یاد رکھو۔ وہ زمانہ ابھی سے نہ بھولو کہ چاروں طرف قحط کی پکار تھی۔ خدا کی خدائی بھوکی مرتی تھی۔ اُس وقت یہ ہی غریب انسان تھا جو دُور دُور سے ہمارے لئے شکار گھیر گھیر کر لاتا تھا۔ اتنے احسان فراموش نہ بنو ذرا اپنی اصل پر جاؤ اور اس کا بھی خیال رکھو کہ بدھ اور جوگ میں یہ لڑکا جنگل کے بڑے بڑے رشیوں سے بڑھکر نکلا ہے۔ آجتک جنگل کے کسی قانون یا آئین کے خلاف اس سے کوئی بات عمل میں نہیں آئی۔"

چودھری کی تقریر ختم ہوتے ہی بگیرا اُٹھا۔ اور نہایت متین اور شریفانہ لہجہ میں یہ دو چار میٹھے لفظ کہے۔ جن میں کسی قدر ترشی بھی تھی۔ "اسکے علاوہ آپ کو یاد ہوگا کہ اس لڑکے کی جان بچانے کے لئے میں نے کل برادری کو کھانا دیا تھا۔ گو ایک جوان موٹا بیل ایسا انمول شکار نہیں ہے کہ اُسکو یاد دلایا جاوے لیکن ہمارا پاس عزت گوشہ خاطر احباب رہنا ضروری ہے۔ ورنہ آپ کو علم ہوگا کہ بگیروں کی قوم میں بھیڑیوں کا خون بہانا کوئی نئی بات نہیں ہے"

بھیڑیوں کی ایک پوری صف کی صف بول اُٹھی "واہ حضرت واہ خوب دس برس کی بات یاد دلائی۔ ایسے باسی گوشت کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔ کہیں رات کو وہی موٹا بیل بھوت بنکر آپ کی گردن پر تو نہیں سوار ہوا تھا"

بگیرا "یہ مجمع محل انصاف ہے محل ظرافت نہیں۔ اگر آپ کو اپنے قول و قرار کا پاس نہیں تو لعنت ہے آپ کی اس آزادی پر اور لعنت ہے آپکے اس انصاف پر"

شیر خاں "بس بس۔ اس بدکلامی سے کیا حاصل۔ بگیرے کو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی آدم زاد ہم صحرائیوں کا ہموطن و ہمقوم تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس لڑکے کا خون روا ہے اور چونکہ وہ ہمارا پرانا

شکار ہے اس لئے اُس کو مار کر کھانے کا حق سوائے ہمارے کسی کو حاصل نہیں۔"

چودہری نے ایک دفعہ پھر تکلیف کی اور کہا "بھائیو۔ یاد رہے کہ یہ انسان ہمارا بھائی ہے۔ گو اس کا ہمارا خون ایک نہیں لیکن پھر بھی یہ لڑکا ہم کو اپنے ماں جائے سے بڑھکر پیارا ہے۔ بس کیوں ایک بھائی کے خون کے درپے ہوتے ہو۔ سُن لو میں اتنے دن جیا ہوں کہ اب زیادہ جینے کی تمنا نہیں۔ اِس آخری وقت میں جو کچھ قسمت کا لکھا تھا وہ سب پورا ہوا۔ جو نہ دیکھا تھا وہ دیکھا اور جو نہ سُنا تھا وہ سُنا۔ افسوس وہ کونسا عیب ہے جسے تم نے کل کے لئے چھوڑا ہو۔ جھوٹا شکار کھانا اب تمہارا شیوہ ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ شیرخاں کے بہکانے میں آکر روز شام کو گاؤں گاؤں گشت کرتے ہو اور گھروں میں سے چھوٹے چھوٹے بچے نرم چارہ کے لالچ میں اُٹھا لاتے ہو اور رانس کا جی لیکر اپنا دھرم کھوتے ہو۔ سچ ہے۔ یا تم سب مر جاتے کہ یہ جنگل پاک ہو جاتا۔ یا میں غارت ہو جاتا کہ یہ دن نہ دیکھتا۔ لیکن تقدیر میں کسکو چارہ ہے۔ تمہاری ان حرکتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ میں تم کو نہایت بزدل۔ سفلہ و کمینہ جانتا ہوں اور اب تم ہی کمینوں سے میرا خطاب ہے۔ سُن لو۔ میرا مرنا یا مارنا یا مارا جانا اب یقینی ہے۔ زندگی چند روزہ ہے اور جتنی ہے وہ بے لطف

اگر یہ نہ ہوتا تو میں خلاف دستور تم سے لڑ کر اس بچہ پر سے اپنی جان فدا کر دیتا۔ لیکن محض قوم کی عزت و ناموس کا خیال ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر اس آدم زاد کے خون سے تم عذر کرو تو میں اپنی جان سے موجود ہوں جس بھائی کا جی چاہے آئے اور مجکو فوراً ہلاک کر دے۔ ہرگز مقابلہ نہ کرونگا اسمیں کم سے کم تین چار بھائیوں کی جان بچ جائیگی۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر تم نے میری بات مان لی تو ایک بیگناہ کے خون ناحق سے بچ جاؤ گے۔ اور یہ وہ بھائی ہے جس کو اپنی زبان سے بھائی کہہ چکے ہو اور جس کی جان کی قیمت قانون کے مطابق ہر شخص وصول کر چکا ہے۔"

بھیڑیے اس تقریر کو خاک بھی نہ سمجھے اور بولے "کچھ ہو۔ ہم اب ایک پل اس آدمی کو اپنے غول میں رکھنے کے روادار نہیں۔" اتنا کہہ بہت سے باغی بھیڑیے شیر کے آس پاس اکھٹے ہونے لگے۔ شیر خاں کو دیدے لال کرتے کیا دیر لگتی تھی جھٹ آنکھیں بدل زور زور سے دُم پھرانے لگے۔ کبھی چکر دیکر اس پاؤں پر دے مارتے تھے کبھی اُس پاؤں پر کبھی آسمان کی طرف اُٹھا کر دُم کو آنکڑا بنا لیتے اور پونچ کا پھندنا پیشانی کا طرہ بنجاتا۔

بگیرے نے جب یہ نوبت دیکھی تو زلفی کے کان میں کہا۔

"زلفی۔ اب بات تمہارے ہاتھ ہے۔ ہم سے اب سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑیگا کہ لڑکر اپنی جان کھودیں اور تمہاری جان بھی مفت میں جائے"

یہ سنتے ہی زلفی دھکتی آگ کی ہنڈیا لیکر اٹھا اور ایک انگڑائی لیکر تمام برادری کے سامنے جمائی لی۔ گویہ علامت اس بات کی تھی کہ ہم کو کسی کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ لیکن دراصل زلفی اس وقت غصّے سے بیتاب تھا کیونکہ آج سے پہلے کبھی کسی بھیڑیئے نے اپنی دشمنی کا حال اُسکے مُنہ پر صاف صاف نہ کہا تھا۔ دوچار اور انگڑائیاں جمائیاں لینے کے بعد زلفی نے آواز تیز کی اور کہا "بھیڑیو۔ کتّوں کی طرح لڑنے اور غصّہ سے پھول پھول کر گدھوں کے برابر ہو جانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ صاحبوں نے اس وقت بار بار جتلایا ہے کہ میں آدمی ہوں۔ اپنی طرف سے تو میں تم بھائیوں کے ساتھ مرتے دم تک بھیڑیا ہی رہتا مگر تمہارے کہنے سے اب ہم بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ ہاں ہم انسان ہیں اور انسان بھی بُری طرح کے۔ آج سے کبھی تم کو بھول کر بھی بھائی نہ کہینگے بلکہ سگ زرد برادر شغال کہا کرینگے۔ تم کو جس قدر بھونکنا تھا بھونک چکے اب ہم کو جو کچھ کہنا ہے وہ بھی سن لو اور ذرا ادھر دیکھو وہی انسان جس پر آج آپ اپنے دانتوں کو تیز اور پنجوں کو صیقل کرتے ہیں آپ کے لئے یہ کیا سوغات لایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

کیسے سُرخ سُرخ انگارہ سے پھول ہیں۔ یہ آج آپ پر نچھاور کئے جائینگے۔

اتنا کہہ زلفی نے آگ کی ہنڈیا زور سے پھرا کر بھیڑیوں کے بیچوں بیچ پھینکدی ہنڈیا ٹوٹتے ہی انگارے پھیلے اور اونچی گھاس میں جو بالکل سوکھی کھڑی تھی آگ لگ گئی اور شعلے اُٹھنے لگے۔ شعلوں کے بلند ہوتے ہی بھیڑیوں کے حواس یک لخت معطل ہو گئے۔ اور ڈر کے مارے دُمیں سمیٹ کر پیچھے ہٹ بیٹھے۔

زُلفی۔ ہنڈیا کے ساتھ ہی ایک سوکھے درخت کی لمبی سی شاخ مع ٹہنیوں اور پتّوں کے توڑ لایا تھا۔ جلتی گھاس میں اس جھاڑ کو سُلگا اُونچے ہاتھ سے سر پر پھراتا ہوا بھیڑیوں کی طرف بڑھا۔

بکرا یہ دیکھتے ہی خوشی کے مارے ناچنے لگا اور چلا چلا کر کہتا تھا "واہ بہادر واہ۔ تجھے کون سکھائے۔ دیکھو۔ دیکھو چودھری کی جان بچا لینا۔ وہ تمہارا ہمیشہ خیر خواہ رہا ہے"

بوڑھا چودھری جو آجتک اپنی جان بچانے کے لئے بھی کسی کے سامنے نہ گڑگڑایا تھا کسی چیز سے خوف کرنا تو کسکو کہتے ہیں شعلوں کو دیکھکر ایسا بدحواس ہوا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ زُلفی اس وقت عجیب شان میں تھا سیاہ بھونرا سے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں شانوں پر چھٹی تھیں۔ جلتے جھاڑ کو جس سے غضب کے شعلے اُٹھ رہے تھے سر پر پھراتا

ہوا چاروں طرف چکر کاٹ رہا تھا۔ اور سُرخ روشنی میں بھیڑیوں کی کالی کالی پرچھائیاں پہاڑوں اور چٹانوں پر اُچھلتی کودتی پھرتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو اس وقت کسی بھیڑیئے کے بدن میں خون باقی نہ تھا۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ بہتسوں کی نبضیں ساقط ہو چلی تھیں۔ زُلفی اب ذرا ٹھیرا اور چاروں طرف نظر ڈالکر بولا "نیچو اب تو دیکھ لیا کہ بس نام کو بھیڑیئے ہو اصل میں بازاری کتّوں سے بھی بدتر ہو۔ لو بس۔ اب ہم اپنے ہمجنسوں میں جاتے ہیں۔ اگر انھوں نے ہم کو غیر نہ سمجھا تو آج سے جنگل کا نام نہ لینگے اور یہ صحبتیں دل سے بھلا دینگے۔ لیکن تمہاری طرح کبھی کسی دوست کو دغا نہ دینگے۔ گو ہمارا تمہارا خون ایک نہ تھا۔ لیکن ہم تم کو بھائی کہہ چکے ہیں اسلئے اب بھی بھائی سمجھکر تمہارے ساتھ کبھی دغا نہ کرینگے۔ گو تم اس لائق نہیں۔" اتنا کہہ زُلفی نے جلتی گھاس اور لکڑیوں میں دو چار ٹھوکریں ماریں چنگاریاں چارو طرف اُڑنے لگیں اور زُلفی نے للکار کر کہا "بھیڑیوں میں ہمیشہ کو نا اتفاقی پیدا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اس فساد کا جو اصل بانی ہے اُس کو بغیر سزا دیئے ہرگز نہ چھوڑینگے۔" یہ کہکر زُلفی شیر خاں کی طرف بڑھا جو نیچے اور دُم سمیٹے گاؤتکئے کی صورت زمین پر پڑے تھے۔ اُلّو کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر شعلوں کو دیکھتے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ زُلفی کے بڑھتے ہی بگیرا بھی کمک کو اُٹھا۔ زُلفی نے شیر کے قریب پہونچکر

اُسکی ٹھوڑی کے بال پکڑ کر کہا "بدتمیز۔ کھڑے ہو کر تعظیم دینی نہیں آتی۔ بہت آدمی آدمی جب رہا تھا۔ اب آپکے یہ چچا جان موجود ہیں۔ اِن کو نہیں پہچانتے۔ بے ادب کھڑا ہو اور جھک کر آداب بجالا۔ نہیں تو سمجھ لیجئے یہ آپکی کاشانی مخمل کی نارنجی عبا اور یہ آپ کا دھاریوں والا پوستین جس پر آپ کو بڑا ناز ہے ابھی جلا کر خاک کر دیا جائے گا۔"

شیر خاں کی دم پر اس وقت جو کچھ آبنی تھی اُس کا حال نہ پوچھو۔ پنجوں اور دُم کا پتا نہ چلتا تھا کہ کدھر ہیں۔ چہرہ پر مُردنی چھائی تھی۔ دونوں کان کنپٹیوں پر اس طرح پڑے تھے گویا جان باقی نہیں ہے۔ دیدے پہلے تو کچھ ٹمٹماتے بھی تھے مگر اب نورِ بصارت گنگا پار چلا گیا تھا کیونکہ شاخ لالہ رنگ چہرہ زعفرانی کے قریب روشن تھی گویا بیچا کو چراغ دکھایا جاتا تھا۔

زُلفی نے شیر کا کان پکڑ بھیڑیوں سے خطاب کیا "بھیڑیو۔ یہ وہی گائے بھینسوں کا بیری آدمیوں کا جلاد کمزوروں کا دشمن ہے جس نے ہم کو مار کر کھانا چاہا تھا۔ اُس کو بڑا قلق تھا کہ ہم نے اُسکی ڈاڑ گرم نہ کی۔ اب دیکھ لو جب انسان انسان کے خون میں آتا ہے تو کس طرح شیر تک کو ذلیل خوار کر سکتا ہے۔ خبردار لنگڑے، کان ہلانا تو کیسا اگر مونچھ تک بھڑکی تو یہ جلتا چیلا تیرے حلق میں ڈالدونگا۔" اتنا کہتے ہی زُلفی نے دو چار جلتی لکڑیاں دھائیں کر کے شیر خاں کی چندیا پر ٹکائیں۔ چندیا کے

بھالو چرمر ہو کر رہ گئے۔ پر یہ میرے شیر دم سادھے آنکھیں بچ کیے اُسی طرح پڑے
چرانڈ سونگھا کیے اور منہ سے اُف تک نہ نکالی۔

زلفی "جا دور ہو موذی۔ لنگڑا تو تھا ہی۔ اب گنجا بھی ہو گیا۔ شیر
کا ہیکو خاصا اودت بلاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اور ابھی کیا ہے جب ہم اس پہاڑ
پر دوبارہ آئینگے تو تیری کھال کی گٹھری ہمارے سر پر رکھی ہو گی۔ اور
بھیڑیو۔ تم بھی سمجھ لو۔ یہ بڈھا چودھری آج سے آزاد ہے جہاں چاہے رہے
اگر کسی نے اس کو ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو جہاں پاؤنگا زندہ زمین میں دفن
کر دونگا۔ یہ ہمارا حکم ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر ہمارے حکم کو توڑا تو اسکی ایک
جان کے بدلے سو کا خون پیکر بھی نہ چھوڑونگا۔ سن لیا بے غیرتو۔ بدتمیزو۔
اب کیوں یہاں بیٹھے گز گز بھر کی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہو۔ جاؤ۔ دور ہو
اپنی صورت نہ دکھاؤ۔ ابھی سُنا نہیں" یہ کہہ زلفی نے جلتا جھاڑ سر سے
اونچا کیا اور اس زور سے سنیٹھی بھراتا ہوا دشمنوں کی طرف چلا کہ بھیڑیوں
میں سب طرف بھاگڑ پڑ گئی۔ جہاں جس کے سینگ سمائے اودھر کو
بھاگا۔ یہ اس پر اور وہ اُس پر کوئی یہاں گرا تو کوئی وہاں۔ کوئی چٹان پر
سے کودا تو کوئی گھاٹی میں لڑھک گیا۔ یہ ایک پنجہ اُٹھائے تین ٹانگ سے
بھاگا تو وہ دونوں پنجے اُٹھائے سر کے بل قلا کرتا نوک دُم ہوا۔ ایک
دوڑتے دوڑتے دانتوں میں دُم پکڑ چکر کھانے لگا تو دوسرا لوٹی کمر سے

پچھلا دھڑ گھسیٹتا گھاس میں تلپٹ ہوگیا۔ کسی کا کان جلا تو کسی کی دم سُلگ اُٹھی۔ کسی کی پیٹھ جھلسی تو کسی کی تھتُھنی پر آبلے پڑے۔ غرض چاروں طرف ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اور ایک پل میں سوائے دس پانچ بھیڑیوں کے جو زلفی کے حمایتی بنکر دُور جا بیٹھے تھے جس قدر بھیڑیے تھے روتے پیٹتے چیختے چلّاتے دُھائی دیتے جدھر رستہ ملا بھاگ نکلے اور سارے جنگل میں حرّاند بھوٹ نکلی۔

جب اس ہُلڑ میں شیر بھی ایک چٹان کی اوٹ میں لڑک کر کہیں کسی کالے مُنہ کے غار میں جان بچانے کو جا چھپے اور باغی بھیڑیے بھی بھاگ گئے تو اب پہاڑ کی چوٹی پر بھیڑیوں کا معزول چودھری، بگیرا اور زلفی بیٹھے رہ گئے۔ اس وقت زلفی کو کچھ اندر ہی اندر بے چینی سی معلوم ہوئی۔ اس سے پہلے اس طرح کی تکلیف اُسکو کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ دو چار سسکیاں لیکر زار و قطار رونے لگا اور چیخیں مار مار کر بگیرے سے کہنے لگا۔ ”بھائی بگیرے۔ بھائی بگیرے۔ بتاؤ تو سہی یہ مجھے کیا ہوا۔ جنگل سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ میرے آنکھوں سے کیا نکلتا ہے۔ کہیں میں مرتا تو نہیں۔ بھائی بگیرے۔ بھائی بگیرے۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو!“

بگیرا ابھی سبورنے لگا اور سیاہ بوتل کے ٹکڑوں پر سے آنسوؤں کی دو موٹی موٹی بوندیں لُڑک کر زمین پر گریں پنجہ سے آنکھیں پونچھکر

نہیں پیارے نہیں۔ اس کو مرنا نہیں رونا کہتے ہیں۔ یہ وہ آنسو ہیں جو انسان رویا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب تم سمجھدار ہو گئے۔ نادان بچے نہیں رہے۔ جنگل بیشک آج تم سے چھوٹتا ہے۔ اس کا صدمہ ہم سے زیادہ کسکو ہوگا۔ اتنے پریشان و مضطرب نہو۔ ان آنسوؤں کو بہ جانے دو۔ پھر جی ٹھیر جائیگا" اس سے پہلے زلفی نہ جانتا تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ پر آج تو وہ ایسا پھڑکا اور پھکارو یا کہ جنگل میں ایسا کوئی بھی نہ رویا ہوگا۔

جب رو دھو کر ذرا دل ٹھیرا تو بولا "لو بھائیو۔ اب ہم آدمیوں میں جاتے ہیں۔ تم سب کو جنگل کے سپرد کیا۔ پر پہلے اپنی ماں سے جس کا دودھ پیا ہے مل لوں" یہ کہکر زلفی اُٹھا اور بہت غمزدہ بھٹ کی طرف چلا۔ اور ماں کے گلے لگ کر خوب رویا۔ باوا جان بھیڑئے نے آبدیدہ ہوکر گلے لگایا اور زُلفی نے رو رو کر ان کا سارا بار ان کوٹ بھگو دیا۔ چھوٹے بھائی بھیڑیوں نے جو سُنا کہ بھیا جنگل سے چلا جائیگا تو خوب چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ زلفی ایک ایک بھائی کو گلے لگا کر سمجھاتا تھا اور آنسے بار بار کہتا تھا کہ بھائیو۔ دیکھو ہمکو بھول نہ جانا"

بھیڑئیے بھائی "واہ بھائی۔ ہم تمکو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ آپ اس کا وعدہ کیجیئے کہ کبھی کبھی پہاڑ کے نیچے آیا کیجیئے گا۔ پھر ہم بھٹ سے

نکلکر آپ سے ملنے آیا کرینگے اور رات کو سب ملکر کھیتوں میں خوب کھیلا کرینگے۔ کیوں بھائی۔ کیوں بھائی کیوں۔ اتنا کیوں روتے ہو۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو"

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ رُو رُو کر زُلفی کے مُنہ سے اپنا مُنہ ملتی تھی۔ ماتھا چاٹ چاٹ کر پنجوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور کہتی تھی "بیٹا۔ جاتے تو ہو۔ پر ہم کو نہ بھول جانا۔ تمہارے باوا بُڈھے ہوگئے ہیں۔ وہ اس غم میں اپنا جی کھو دینگے۔ گو تم آدمی کے بچّے تھے پر جنگل خوب جانتا ہے کہ تمہارے سامنے اپنے پیٹ کی ماںتا کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھی۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو"

زُلفی "نہیں اماں۔ میں ضرور ضرور آؤنگا۔ اور اَبکے جب آؤنگا تو اس شیر خاں موذی کی کھال کھینچکر ساتھ لاؤنگا اور چودھری والی چٹان پر اُسکو بچھا کر بھیڑیوں کے سردار کو اُس پر بٹھاؤنگا۔ اماں دیکھنا تمہارے پیچھے جنگل کے سو دھندے لگے رہتے ہیں۔ کہیں مجکو نہ بھول جانا۔ نہیں تو میں مرجاؤنگا۔ لو اب میں جاتا ہوں۔ جنگل والوں سے کہدینا کہ زلفی تم سب کو یاد کرتا ہوا جنگل سے رخصت ہوا۔ ہُو۔ ہُو۔ ہُو"

اس رونے پیٹنے اور رخصت ہونے میں صبح کے آثار مشرق سے ظاہر ہوئے اور ہمارا زُلفی افسردل خستہ حال آنکھوں میں آنسو۔ دل

ہیں درد۔ پہاڑ سے اُترا تاکہ اُن جانوروں میں بود و باش اختیار
کرے جن کو دنیا میں انسان کے نام سے پُکارتے ہیں۔

بالخیر تمّت

پیارے لڑکو۔ جنگل کی پہلی کہانی ختم ہوئی۔ تم جی میں خفا ہوگے کہ شیر کو جیتا چھوڑ دیا اور زُلفی کا حال آگے کچھ نہ سُنایا۔ ایک ایک سے پوچھوگے کہ "پھر کیا ہوا" پھر کا حال تو یہ ہے کہ زُلفی خدا کے فضل سے ابتک زندہ سلامت ہے۔ جنگل میں اُس نے بڑے بڑے کام کئے۔ ہر ایک کام کی ایک جُدا کہانی ہے۔ اگر اس کہانی کو پسند کیا تو اور کہانیاں بھی سُنائینگے۔ کہانیاں سُنانے والے تو بہت ہیں پر کوئی دل سے سُناتا ہے کوئی اوپری دل سے۔ اب تم ہی کہو یہ کہانی کیسی محنت سے لکھکر تمھیں سُنائی ہے۔ جہاں کہیں سمجھ میں نہ آئے مجھ پر خفا نہ ہونا۔ کسی بڑے سے مطلب پوچھ لینا۔

عجیب و غریب لطیفے - یہ کتاب ترین لطیفوں کا مجموعہ ہے جو بچوں کی تفریح طبع کے لئے نہایت کوشش و احتیاط کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ عبارت سلیس اور بہت آسان ہے اُمید کہ چھوٹے بچے اس کتاب کو پڑھکر خوش ہونگے۔ اور دوسری کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ قیمت ۱۰

نبی جی کی خوشی - یعنی زنانہ محافل میلاد میں پڑھنے کے قابل ایک نئے طرز کا مولود شریف مرتبہ ن ب صاحبہ بدایونی مطبوعہ نظامی پریس بدایون۔ قیمت ۱۰

آفتاب رسالت - جسمیں پیغمبر آخر زمان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے حالات نہایت صحیح صحیح صاف اور سادہ طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے مذھبی جلسوں اور مولود شریف کی محفلوں میں پڑھی جائے جس سے عوام الناس کو برکت اور واقفیت حاصل ہو - مؤلفہ مولوی سید عبدالسبحان صاحب۔ قیمت ۴

ملنے کا پتہ: آنریری مینیجر بک ڈپو مدرسۃ العلوم علیگڈھ

اور محمدن کالج کی
ہے اور پھر دونو
ت اور کفایت
از کم ایک بار
سکتا ہے۔
مینان بخش

یں سے نکلتا ہے
لج کی بنا سے بھی

کے علاوہ عام اور مفید
دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ نمونہ مفت
اشتہارات کا نرخ زبانی یا خط وکتابت سے طے ہوسکتا ہے۔
ہر قسم کی خط وکتابت کیلئے پتہ: مینیجر صاحب انسٹیٹیوٹ پریس علیگڈھ